



اسلام کا معاشی نظام

افضل اسلامی ریاست کا نظامِ محاصل

© rasailojarai



ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-۷۰ مہاراجہ شاہنشاہی روڈ لاہور

© rasailojarai

تقدیم

یہ کتاب پچراقم الحروف کی آج سے تین چار سال قبل کی دو تقریروں پر مشتمل ہے: پہلی زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں کی گئی تھی اور دوسری محکمہ محنت، پنجاب کے زیر اہتمام مل مالکان اور مزدور لیڈروں کے ایک مشترک اجتماع میں کی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی تقریریں میں نے حسب عادت 'روادری' میں کہیں۔ لیکن ان دونوں کی پذیرائی میرے انداز سے بہت بڑھ کر ہوئی۔ خصوصاً فیصل آباد کی تقریر کے صدر تھے ڈاکٹر غلام رسول چودھری جو خود معاشیات میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ان کا تاثر تو ان کے رقم کردہ پیش لفظ میں قارئین کے سامنے اسی جائے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس اجتماع میں چودھری صاحب کے علاوہ مزید نصف درجن سے زائد معاشیات کے پی ایچ ڈی موجود تھے۔ بعد میں چچا کے اجتماع پر ان سب حضرات نے متفقہ طور پر فرمایا کہ آج پہلی بار اسلام کا معاشی نظام کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ میں نے اسے کچھ تو ان حضرات کے حسنِ ظن پر محمول کیا اور کچھ اس پر کہ میری ہمت افزائی مقصود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنی ان تقریروں کو ہرگز قابل اشاعت نہیں سمجھا تھا۔ البتہ یہ ضرور خیال تھا کہ کبھی فرصت ملی تو نظر ثانی کے بعد اشاعت ہو سکتی ہے۔ لیکن محترم چودھری غلام رسول صاحب نے ان کی اس درجہ قدر افزائی فرمائی کہ دونوں تقریروں کو خود ڈیٹپ سے منتقل کر کے، اپنے ذاتی خرچ پر ایک کتابچے کی صورت میں غالباً دس ہزار کی تعداد میں طبع کرایا، اور مفت تقسیم کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

ادھر کچھ عرصہ سے بعض احباب کا شدید تقاضا تھا کہ ہم اسے خود اپنے اہتمام میں بھی شائع کریں۔ اس ضمن میں بھی چوہدری صاحب نے مزید کرم یہ فرمایا کہ کتابت شدہ کاپیاں عنایت فرمادیں۔ چنانچہ یہ کتابچہ بالکل من عن اسی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں چوہدری صاحب نے طبع کرایا تھا۔ اس ضمن قارئین سے یہ معذرت کہنے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دونوں تقریریں میں بعض مضامین مکرر آئے ہیں۔ اب یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے، چاہیں تو اسے 'قندِ مکرر' سے تعبیر فرمائیں، اور چاہیں تو بد مذاقی پر محمول کر لیں۔

میں چونکہ رہ معاشیات کا باضابطہ طالب علم ہوں نہ فقہ اسلامی کا ماہر — لہذا اس میں غلطیاں لازماً ہوں گی۔ جو حضرات اس ضمن میں مجھے متنبہ فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں ان کا پیشگی شکریہ!

ان دو تقاریر کے علاوہ اس کتابچے میں موعظ کی مناسبت سے دو مختصر چیزیں مزید شامل کی جا رہی ہیں: ایک راقم کا ایک مختصر مقالہ جو اس نے "اسلام کا نظام محاصل" کے عنوان سے لائسنز کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا تھا۔ اس میں اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں بعض اصولی باتیں تو پھر مکرر آگئی ہیں تاہم اہل فکر کے لئے چند نئے نکات قابل غور موجود ہیں۔ اور دوسرے پاکستان کے نظام محاصل کے اس اہم ترین مسئلے پر کہ آیا یہاں کی اراضی عُمّری ہیں یا خراجی، پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کا ایک مختصر مراسلہ جو "میشاق" جنوری فردری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس موضوع پر نہایت اہم حوالے موجود ہیں۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور ۲۲ اگست ۱۹۸۵ء

پیش لفظ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دینی حلقوں میں تو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں کہ آپ کی بنیادی تعلیم سائنس اور طب کی ہے مگر آپ کی نمایاں خدمات دین اسلام کی تعلیم تبلیغ میں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے وقت میں طب کے پیشہ کو ترک کر کے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اوقات کو دین کے اجراء کے لیے وقف کیا جب اہم خط و کلام کا شمار تھی۔۔۔۔ لہذا ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے شعر سے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مصداق اُمت کی پاسبانی فرمائی۔

راقم الحروف جب لکچی سن کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے تعینات تھا اس وقت ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً زحمت دیتا رہا مگر ہر دفعہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری دعوت کو شرف قبولیت بخشا اور نہ صرف کالج کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنے ایمان افروز خطابات سے نوازا بلکہ کالج کی جزوقتی لیکچرر شپ بھی قبول فرمائی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کے دو اہم خطابات ”نجات کی راہ“ اور ”علامہ اقبال اور ہم“ راقم نے بڑے شوق سے طبع کروائے اور بہت پسند کیے گئے۔

بعد ازاں جب مجھے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب تکلیف فرما کر وقتاً فوقتاً یونیورسٹی تشریف لے جاتے رہے اور خطابات جمعہ کے علاوہ ”سیرۃ النبی“ اور ”امۃ مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل“ جیسے اہم موضوعات پر یادگار خطاب فرمائے اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے سینیٹ اور سٹڈنٹ کیونسل کی رکنیت بھی قبول فرمائی۔

راقم کا گہرا احساس یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے جو قوت اشتدال، انداز بیان اور قوت افہام عطا فرمائی ہے وہ اس نے آج تک کسی پروفیسر میں نہیں

پائی۔ راقم کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے ڈاکٹر صاحب کو زرعی یونیورسٹی کے تاحیات اعزازی پروفیسر بنانے کی تجویز تیار کی جو نیکیٹ کو مغربی کے لیے پیش ہونی تھی۔ معاشیات کے میدان میں اسلام کی اصل تعلیمات کیا ہیں؟ یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس پر کوئی واضح بات "نمال سامنے نہیں آئی تھی۔ ہماری کوشش زیادہ تر یہی رہی کہ "Western Economics" میں چند تبدیلیاں کر کے اسی کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے، جو مناسب نہیں۔ چونکہ راقم بھی اسی شعبہ علم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کو اس مضمون سے خاص دلچسپی تھی۔ لہذا ہم نے اس معاملے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے کلیہ معاشیات و دہی عمارات کے تحت طلبہ و ماہرین معاشیات سے "اسلام کا معاشی نظام" کے موضوع پر مسلسل خطاب فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے جہاں اسلام کی تعلیمات کے نئے گوشے سامنے آئے وہاں یہ امر سب حاضرین کے لیے حیرت کا باعث ہوا کہ ڈاکٹر صاحب معاشیات کے نہ تو کبھی طالب علم رہے تھے اور نہ ہی اس شعبہ سے کبھی متعلق۔ لیکن اپنی بصیرت باطنی کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑے معیشت دان معلوم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خطاب میں اسلام کی اصلی تعلیمات کو قرآن حکیم کی محکم آیات کے حوالے سے پیش کیا اور عام معمول کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے موجودہ نظاموں میں سے کسی پر اسلام کی مہر تصدیق ثبت کرنے کی بجائے اسلام کی اپنی تعلیمات کو پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اشتراکی نظام کا آئیڈیل "مساوات" اور سرمایہ دارانہ نظام کا آئیڈیل "آزادی" ہے جبکہ اسلام مساوات اور آزادی دونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب کہ اس کا اصل نعرہ "عدل" ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے "روحانی" اور "قانونی" نظام کا جو فرق بیان فرمایا اس نے تو گویا اس موضوع پر جملہ پیچیدگیوں کو حل کر دیا۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ تحقیق و تجسس کی نئی راہیں کھولے گا اور ملکی معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے مدد و معاون ثابت ہو گا۔

غلام رسول چودھری

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
تَحْمَدُهُ وَتُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

اسلام کا معاشی نظام

الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ
فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ - وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ
وَنَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم تَسْلِيمًا
كَثِيرًا كَثِيرًا اٰمًا بَعْدُ :

حضرات! اس دور کے بارے میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے
جو کچھ زیادہ غلط بھی نہیں ہے کہ یہ معاشیات کا دور ہے واقعہ یہ ہے کہ آج کا
انسان بنیادی طور پر معاشی انسان بن کر رہ گیا ہے۔

اجتماعیات انسانی میں بھی یقیناً معاشیات اور اقتصادیات کو بنیادی
اہمیت حاصل ہے۔ اور ہمارے ملک میں اسلام کی جانب جو قدم اٹھانے کی
کوشش کی جا رہی ہے اس کے ضمن میں فطری طور پر یہ سوال ذہنوں کو پریشان
کر رہا ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے؟ بعض لوگوں نے اسلامی اقتصادیات
کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی وجہ سے ایک تصور لوگوں کے ذہنوں میں موجود
ہے کہ شاید اسلام کا اقتصادی نظام ہمارے موجودہ نظام میں زکوٰۃ اور عشر کے
اضافے اور ذرا مزید ہمت کر کے سود کی لعنت کو ختم کر دینے کا نام ہے۔ گویا
معیشت کا بنیادی ڈھانچہ یہی رہے گا اور بس اتنا سا تغیر و تبدل ہی مطلوب
ہے اور اسی بنیاد پر کچھ لوگ بدینتی کے تحت اور کچھ مغالطے سے لوگوں
کو بھٹان کر رہے ہیں کہ اسلام کے پاس معاشی مسائل کا کوئی حقیقی، واقعی اور

موثر حل موجود نہیں ہے۔ میں اسی لیے آج یہ جُرأت کر رہا ہوں کہ اسلام کے معاشی نظام یا قرآن مجید کی اقتصادی ہدایات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں۔ حضرات! میں اپنی اصل گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل دو معذرتیں پیش کروں گا اور دو مقدمات۔

معذرتیں

الف : پہلی معذرت تو یہ کہ اصولاً اسلامی معاشیات پر گفتگو کرنے والے شخص کو جدید معاشیات اور اقتصادیات کا علم بھی براہ راست ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن وحدیث اور فقہ پر بھی اس کی نظر بہت گہری ہو۔ اسلام کی ایک میدان کے اعتبار سے تو وہ یہ دعوے کر سکے کہ اس کے علم کی تحصیل کسی درجے میں اس نے مکمل کر لی ہے۔ جبکہ مجھے ان میں سے کسی چیز کا دعویٰ نہیں... میں اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں قرآن مجید کا طالب علم ہوں۔ البتہ قرآن چونکہ ہُدًی لِلنَّاسِ (تمام انسانوں کے لیے راہنمائی) ہے اور اس کا اصل موضوع ہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق رہنمائی دینا ہے۔ لہذا اصولاً بھی یہ ممکن نہیں تھا اور فی الواقع بھی ایسا نہیں ہے کہ معاشیات جیسے اہم موضوع پر کوئی ہدایات اس میں نہ دی گئی ہوں۔ چنانچہ اس میں جہاں عبادات کے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں۔ اور ان کی حکمتیں بھی زیر بحث آئی ہیں۔ اسی طرح زندگی کے تمام گوشے اس میں موضوع بحث بنے ہیں اور اس ضمن میں احکامات بھی وارد ہوئے ہیں اور ان کی حکمتوں کا بیان بھی ہوا ہے چنانچہ معاشیات کے اعتبار سے بھی قرآن مجید میں ایک طرف تو کھلے کھلے احکام بیان کیے گئے ہیں دوسری طرف کچھ ایسے مقاصد اور بنیادی حکمتوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا لحاظ ان احکام میں رکھا گیا ہے لہذا میں ان دونوں پہلوؤں سے کوشش کروں گا کہ اپنے مطالعے کا حاصل آپ حضرات کے سامنے لاؤں۔

ب : دوسری معذرت یہ ہے کہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنی بات نہ فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں اور نہ میں اس کی کوشش ہی

کروں گا۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ جن اصطلاحات کے لوگ عادی ہو چکے ہیں انہی کے حوالے سے بات کروں تاکہ بات فوراً سمجھ میں آجائے مثلاً Capitalism (سرمایہ داری نظام) اور Socialism (اشتراکی نظام معیشت) کی اصطلاحات ہمارے ہاں معروف ہیں۔ لوگ اکثر و بیشتر ان اصطلاحات اور ان کے مفہوم سے بنیادی طور پر واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ ہی یہ نظام ہمارے معیشت ہیں جو اس وقت بالفعل دنیا میں قائم ہیں۔ مجھے خوب اندیشہ ہے کہ اس طرح عین ممکن ہے کہ مجھ پر Over simplification کا الزام عاید کیا جائے یا کوئی صاحب یہ سمجھیں کہ میں جدید اصطلاحات سے مرعوب ہوں لیکن اس کے باوجود میں بات پہنچانے کے لیے اس طریق کو اختیار کر رہا ہوں کیونکہ میرے نزدیک بات ذہنوں تک پہنچانے کے لیے یہی طریقہ سب سے موثر ہے۔

دو مقدمات

اب میں چاہتا ہوں کہ دو مقدمات آپ کے سامنے رکھوں کیونکہ میری گفتگو انہی پر مبنی Based ہوگی۔

پہلا مقدمہ: اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا کے ہر نظام کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک فکری اساس اور دوسرا علمی ڈھانچہ۔ یہ دونوں پہلو باہم مربوط ہوتے ہیں اور کسی بھی نظام کو اس کی فکری اساس سے ہٹا کر موضوع گفتگو نہیں بنایا جاسکتا۔ اسی طرح اسلام کے بارے میں نظریاتی اساس اور بنیاد کا معاملہ انتہائی اہم ہے جس کو ہم اصطلاحاً ایمان سے تعبیر کرتے ہیں اسلام درحقیقت ایمان پر قائم ہے۔ اللہ پر یقین کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اس نے اس کائنات کو اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمَّی (ایک متعین وقت تک) کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے اور ہماری زندگی یہ دُنوی زندگی

لے ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارے پاس ایک تیسرا نظام معیشت ہے۔ جو ان دونوں کے اچھے پہلوؤں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے لیکن یہ چیز اس وقت تک صرف ایک دعویٰ کی حیثیت رکھتی ہے جب تک کسی معاشرے یا کسی ملک میں یہ نظام قائم کر کے نہ دکھایا جائے

ہی نہیں بلکہ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ انسان کا اصل مسئلہ اُس زندگی سے متعلق ہے اس زندگی سے نہیں۔ گویا ہماری اعتقادی اساس اور نظریاتی بنیاد کے اعتبار سے نسبت و تناسب (Ratio and proportion) میں اس دنیوی زندگی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، یہ تو گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ عارضی اور فانی ہے جب کہ وہ ابدی ہے اور ہمیشہ کی زندگی ہے۔ یہ ہمارے ایمان کی دو بنیادیں ہیں جو قرآن حکیم کی ایک ہی آیت میں ان مختصر الفاظ میں سموی ہوئی ہیں: "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" کہ اللہ ہی ہمارا ابدی ہے اور معاد بھی۔ یعنی ہم اللہ کے پاس سے آتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایمان اگر واقفانہ دل میں موجود ہو تو اس کا حاصل تو یہی ہے کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کی جائے جیسے کوئی اجنبی ہو یا راہ چلنے والا مسافر۔ ایک راہ گزر کو اپنے راستے سے جو دلچسپی ہو سکتی ہے اس دنیا اور اس کے تعلقات کے ساتھ اس سے زائد دلچسپی از روئے ایمان درست نہیں ہے۔ اسلام کی اس بنیاد سے دو نتیجے اخذ کیجیے۔

① پہلا یہ کہ اگرچہ سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام بظاہر تو ایک دوسرے کی کامل ضد ہیں کیونکہ نظام کے اعتبار سے ایک مشرق کی بات ہے تو دوسری مغرب کی۔ لیکن فکری بنیاد ان دونوں کی ایک ہی ہے یعنی مادہ پرستی۔ یہ مادیت (Materialism) ہی تھی جس نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مادیت ہی بنیاد ہے مغربی جمہوریت (Western democracy) کی کہ جس کے ساتھ کیپیٹلزم کا ضمیمہ لگا ہوا ہے اور اس مادیت ہی کی ایک زیادہ ترقی یافتہ شکل جدلی مادیت ہے جس سے وہ دوسرا نظام پھوٹا ہے جسے ہم سوشلزم اور کمیونزم یا اس کے مختلف شیڈز (Shades) سے پہچانتے ہیں۔ ایک بات تو یہ پیش نظر رہے کہ اسلام کا معاملہ ان

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے شانے پکڑ کر ازراہ شفقت فرمایا "کن فی الدنیا کانتک غریب او عابر سبیل" دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی اجنبی یا راہ چلتا مسافر۔

دونوں سے بنیادی طور پر جدا ہے۔

۲) اور دوسری بات ذہن میں یہ رکھنا ہوگی کہ چونکہ اسلام کا نظام اپنے تفصیلی ڈھانچے سمیت صرف اپنی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہ کسی دوسرے نظام کی پیوندکاری قبول نہیں کرتا لہذا پہلے اس نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے اس لیے کہ اسلام کھڑا ہوگا تو ایمان کی بنیاد پر۔

دوسرا مقدمہ

گو ایمان کی رُو سے اصل اہمیت معاد (آخرت) کی ہے، معاش کی نہیں۔ یہ دُنیا اور اس کا ساز و سامان یہیں رہ جانے والا ہے اور انسانوں کے لیے ثانوی اہمیت کا حامل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسلام کے پورے نظام فکر و عمل میں عدل و قسط اور انصاف کے قیام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جوشائیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قَائِمًا بِالْقِسْطِ (اللہ قسط اور عدل و انصاف کو قائم کرنے والا) ہے۔

پھر اسی کا حکم سورۃ نسا میں ان الفاظ مبارکہ میں وارد ہوا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ (النساء ۱۳۵)

اے ایمان والو۔ عدل و انصاف کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔

اور سورہ مائدہ میں یہی حکم عکسی ترتیب سے وارد ہوا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۸)

اے ایمان والو۔ اللہ کے لیے پوری قوت کے ساتھ کھڑے ہونے والے

اور عدل و انصاف کے گواہ بن جاؤ۔

ان سے اہم تر ہے یہ حقیقت کہ قرآن حکیم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں بالکل معین طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کتابوں کے نازل کرنے اور رسولوں کے بھیجنے کا اصل مقصد اور اسلام کے پورے نظام کا مرکزی خیال ہی عدل و قسط کا نظام قائم کرنا ہے

لے الکفر ملّة واحدة۔ کفر کے کتنے بھی رنگ (Shades) ہوں کتنی ہی مختلف صورتیں ہوں وہ درحقیقت ایک ہی شے ہے ایک ہی ملت ہے۔

سورۃ آل عمران آیت ۸ -

گویا اسلام کے نزدیک یہ ایک اہم قدر ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ
النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحديد۔ آیت ۲۵) انبیاء و رسل کے بارے میں اس عام
قاعدہ کلیہ پر مستزاد ہے وہ ہدایت جو معین طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔
”تم (اے محمد) اسی دین کی طرف لوگوں کو بلاتے رہنا اور جیسا تمہیں حکم ہوا
ہے اسی پر قائم رہنا اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا اور کہہ دو کہ جو
کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے
حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں۔“ (سورہ شوریٰ آیت ۱۷)

پھر یہی اصول اور ہوسے تو ایرانیوں نے حملے کی وجہ دریافت
کی تو فاتح ایران حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے ان الفاظ میں ان کو جواب دیا :
”ہم تو بھیجے گئے ہیں (خود نہیں آئے) کہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے
نکال کر ایمان کے نور میں اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے پنجے سے
نکال کر اسلام کے عدل میں لے آئیں۔“

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ جو آپ نے بیعت
خلافت کے بعد ارشاد فرمایا تھا اور جو واقعاً ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کو
متین کرتا ہے اس میں وہ جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے :

”تم میں سے ہر قوی میرے لیے ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول
نہ کروں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے لیے قوی رہے گا جب تک
اس کو اس کا حق نہ دلوں۔“ تو گویا قیام عدل و قسط اسلام کا مرکزی

خیال ہے۔

حال ہی میں جو سالانہ قرآن کانفرنس کراچی میں ہوئی اس میں ایک صاحب
نے بڑی عمدہ بات کی طرف توجہ دلائی کہ اس وقت جو دو نظام دنیا میں قائم ہیں ان
میں ایک ایک لفظ مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ کیپیٹلزم کا مرکزی خیال آزادی
(Freedom) ہے جبکہ کمیونزم کا مساوات (Equality) ہے یہ ان لوگوں کے سلوگن
ہیں۔ ذہن میں رہے کہ یہ دونوں بڑی اہم انسانی قدیں ہیں۔ لیکن اسلام کا بنیادی

خیال (Basic theme) ”عدل“ ہے۔ وہ آزادی اور مساوات دونوں کو عدل کا پابند کرتا ہے۔ گویا وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل قائم کرتا ہے تاکہ نہ آزادی اتنی بڑھ جائے کہ مساوات کو بالکل ہٹپ کر جائے یعنی (Freedom at the cost of equality) نہ ہواور نہ ہی مساوات کا ہوا اتنا بڑھ جائے کہ وہ آزادی کو بالکل نکل جائے یعنی (Equality at the cost of Freedom) بھی نہ ہو۔ اسلام کا مرکزی تصور عدل ہے اور وہ اس عدل کو ہر گوشہ زندگی میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔

قیام عدل و قسط کی اہمیت

بہت بڑے عالم اور جدید معاشرتی اور سماجی مسائل کی طرف دو صدی قبل توجہ دلانے والے، اور ان کا قرآن و حدیث کی روشنی میں حل پیش کرنے والے عظیم مجدد دین امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام میں عدل و قسط کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس پر انھوں نے بہت عمدہ دلیل قائم کی ہے کہ اسلام یہ عدل اس لیے قائم کرنا چاہتا ہے کہ اگر کوئی جابرانہ اور ظالمانہ (یا جدید اصطلاح میں استحصالی) نظام رائج ہو جائے تو اس کے نتیجے میں آبادی کی ایک عظیم اکثریت بالکل حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے اور اس کے لیے کسی اعلیٰ سوچ، فکر یا خیال کا امکان ہی باقی نہیں رہتا اور اکثریت کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ کولہو کے بیل اور باربرداری کے اونٹ کی مانند اپنی دو وقت کی روٹی کے لیے جان گسل محنت میں صبح سے شام تک مصروف رہے تو کہاں اللہ سے محبت کرنا اس کو چاہنا، اس سے لو لگا کر بیٹھنا یا کسی اعلیٰ فکر کی طرف متوجہ ہونا۔ گویا اب انسانوں کے لیے اس مقصد کو پورا کرنا ممکن ہی نہیں رہتا کہ جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی تھی۔

بفحوائے الفاظ قرآنی وَمَا خَلَقْتُ الْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُنِي کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔

لہذا اسلام یہ چاہتا ہے کہ نظام عدل و قسط قائم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ

”تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے“

کو موقع حاصل ہو کہ اللہ کی معرفت حاصل کریں، اس سے محبت کریں اور اس سے لو لگائیں۔

ان دو مقدمات کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔
حضرات! اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل و قسط کا جو مقام متعین کیا ہے اور جس میں اس نے مساوات اور آزادی ایسی دونوں اعلیٰ اقدار کو خوبصورتی سے سمویا ہے وہ نظام کیا ہے؟ ہمیں اس کی طرف آتے ہوئے ایک بات کہنا چاہتا ہوں جو شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے اور یہی میں چاہتا ہوں کہ ذہن بیدار ہو جائیں۔ وہ یہ کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں دو ہیں۔ دونوں کا ایک نظریہ ملکیت ہے۔ نظریہ حقوق، نظریہ قدر زائد (Surplus Value) ہے یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی بھی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں اور یہ سب چیزیں ان دونوں میں بالکل جُدا جُدا ہیں۔ کوئی چاہے تو یوں کہہ لے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ ہیں لیکن بہر حال ان کے علیحدہ علیحدہ وجود سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے انٹرکونکٹڈ بھی ہیں۔ بہت حد تک انٹر ڈیپنڈنٹ بھی۔ اور اسلام کی برکات اور اس کے ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے ہو سکتا ہے۔

اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو ننگا ہوں سے اوجھل ہو جائے اور توخہ صرف ایک ہی پر مرکوز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دُور ہوگی۔ ان میں سے ایک اسلام کا رُوحانی و اخلاقی نظام ہے۔ اور دُوسرا قانونی و فقہی نظام۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے

لے ایک اہم بات یہ پیش نظر رہے کہ قرآن و حدیث میں نظام اسلامی یا نظام مصطفیٰ کی اصطلاحیں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ نظام کوئی جامد شے نہیں بلکہ ہر دور کی علمی اور معاشرتی سطح کے مطابق نظام وجود میں آتا ہے اس سلسلے میں اسلام کی رہنمائی ”ہدایات“ اور ”حدود“ کی صورت میں ہے۔ اسلام نے حلال“ اور حرام“ کی کچھ حدود و متعینات کی ہیں جن کی جمع و تدوین سے نظام وجود میں آتا ہے۔

امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو "دعویٰ" (Thesis) اور "جواب دعویٰ" (Anti-thesis) سے تعبیر فرمائیں اور ان دونوں کے امتزاج کو synthesis قرار دے لیں۔ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ کوئی شخص آپ کے ایک تھپیڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور ہیں تو اس صورت میں "قہر درویش بر جان درویش" کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہے ہی نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں: ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام ملے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَا اُولٰٓئِكَ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُوْنَ (البقرہ-۱۷۹) لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے۔ یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔ چنانچہ شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے: وَٱلْكَافِرِينَ الْغِيَظُ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (سورۃ آل ۱۳۲) یعنی وہ لوگ جو غصہ کو پنی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں۔ دیکھ لیجیے کہ عفو و قصاص ایک سرے کی بالکل ضد ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسن معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled capitalism) ہے اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے۔ اگرچہ اسے "سرمایہ دارانہ نظام" بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراح صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت ہے اور ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس کے آگے

کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی۔ لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں "ایمانی تعلیم" کی رو سے انسانی ملکیت کی کُل نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ "لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے۔ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہوگا خواہ وہ زمین ہو، مکان ہو، ساز و سامان ہو، روپیہ پیسہ ہو، وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں، اس کے ہاتھ پاؤں، اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ اور جسم و جان اور اس کی کُل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ

ایں امانت چند روزہ نزد ما است و حقیقت مالک ہر شے خدا است

یا بقول علامہ اقبال مرحوم

رزق خود را از زمین برون رواست ایں متاع بندہ و ملک خدا است

اس اعتبار سے بھی ہمارے ہاں بڑی کینغوٹن پائی جاتی ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہل قلم ایسی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی کامل نفی کرتے چلے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی، کہ جب "قُلِ الْعَقُوْلُ" فرما دیا گیا تو زائد چیز جبراً بھی وصول کر لی جائے گی اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے ہیں جب کہ وہ دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قانون وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیے گئے تھے، کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حق تصرف (جو بہت قریب ہو جاتا ہے حق ملکیت کے) یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثتاً منتقل بھی کیا جاسکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور اصحاب قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ

اے محتاج ضرورت سے زائد سے اللہ کی راہ میں دے ڈالو۔

دوسرا پہلو دب گیا ہے یعنی "قل العفو" کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں نہیں آتی۔ یاد رہے کہ یہ کفوژن (اکھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دور اول یعنی خلافت راشدہ کے دوران بھی پیدا ہو گئی تھی مثلاً حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلبہ زہد کے باعث یہ رائے قائم کی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں۔ آپ نے آیہ کثر کو بالکل اس کے خلاف الفاظ پر معمول کیا۔ خلافت راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام اُمت جمع تھی اس رائے کو ایک انتہائی موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں انھیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ ایک بیابان میں انھوں نے جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا بلکہ یہ نظام اسلامی کا وہ روحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب دینا چاہتا ہے یہی وہ توبہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور روحانی مراتب کے حصول کے لیے آگے جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ ایمان بھی ہے۔ اور اس سے اوپر احسان کا درجہ بھی جائز ہے۔ مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک منالطہ تھا جو حضرت ابوذر غفاری کو پورے لیکن رخص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن آج یہ منالطہ جان بوجھ کر اور بدیتی کے ہوساتھ دیا جا رہا ہے کیونکہ آج تو خلافت راشدہ کا نظام پورے کا پورا ہمارے سامنے موجود ہے اور اُمت کے اس اجتماعی فیصلہ کو نظر انداز کرنا بغیر بدیتی کے ممکن ہی نہیں۔

۱۔ سورۃ توبہ : ۳۴

حضرت ابوذر غفاریؓ کے احساس کا یہ عالم تھا کہ وفات کے قریب آپ نے زوہر محترم سے فرمایا کہ تم نے یہ کیا سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لیے ہیں تو انھوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو۔ تو آپ نے معمولی چیزوں جیسے تو، چٹا اور دھچکی کا حوالہ دے کر کہا یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد۔ حضرت ابوذر کے اسی غلبہ زہد کی وجہ سے آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ میرے ساتھی ابوذر کو دیکھ لے۔

روحانی نظام کے چار اصول

اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں پھر مرتب کر لیجیے۔
انسانی ملکیت کی کلی نفی۔

① انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں اللہ کا فضل ہے۔
② گو دکان پر وہ بیٹھا ہے، کھیت میں ہل اس نے چلایا ہے، محنت اس نے کی ہے، لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اس کا فضل سمجھے۔ اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حق اسی قدر سمجھو گے جس قدر اللہ نے معین کیا ہے۔

③ انسان کا جائز حق کیا ہے؟ صرف اس کی ضروریات کے بقدر، ان کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے۔
الف : اگر دو وقت کھانے کے لیے مل گیا ہے۔
ب : سر چھپانے کے لیے اگر کوئی پھت موجود ہے۔
ج : پہننے کے لیے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔
د : اور اپنے کردار، اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لیے اگر ایک بیوی مل گئی ہے۔

تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا اور اس سے زائد جو کچھ ہے وہ تمہارا نہیں دوسروں کا حق ہے۔ اس کو پہنچا دو ان تک کہ جن کے پاس نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے بکدوش ہو گئے کہ جو امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کر دی گئی تھی اور یہی ہے درحقیقت وہ مقام جہاں تک "قل العفو" کا سارا فلسفہ پہنچانا چاہتا ہے کہ تمہارے پاس جو بھی 'قدر زائد' ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ ضرورت پوری ہو گئی تمہارا حق مکمل ہو گیا اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہے مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔
گویا ہر ملک مکمل نظام ہے اس میں ملکیت اور قدر زائد اور یہاں تک کہ

اس قدر زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے اس سلسلے میں سورۃ روم کی ایک آیت بارگاہی ملاحظہ ہو جس میں ربو (سود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے۔ فرمایا :

وَمَا آتَيْتُم مِّن رَّبًّا لِّيُؤْتُوا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَزْبُغُوا عِندَ اللَّهِ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْغَفُونَ (سورة الروم- ۳۹)

گویا دین کی روحانی تعلیم کے اعتبار سے ربو درحقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے مثال کے طور پر ایک شخص ملازم ہے اس کو تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بدلے میں اس کو سرمایہ کو بکھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) یہ بھی درحقیقت اس روحانی سطح پر ربو ہی قرار پائے گا کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمایے کا مصرف صرف ایک ہے کہ اس کا مالک محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے۔ یہ ان کو دے دیا جائے کہ جو محروم ہیں۔ یا جن کے پاس کاروبار کے لیے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے۔ گویا فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر جائز ہے مگر روحانی اور اخلاقی تعلیم میں یہ چیز ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے۔

قانونی اور فقہی نظام

حضرات - جیسا کہ عرض کیا ہے اسلام کا قانونی اور فقہی نظام معیشت ایک طرح کے کنٹرولڈ کیپیٹلزم سے مشابہ ہے۔ اس میں تمام فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی رو سے انسان کو اپنے مال پر حق تصرف حاصل ہے۔ عام حالات میں صرف زکوٰۃ کی حد تک اس سے جبراً وصول کیا جائے گا باقی اگر وہ شوق سے چاہے تو اللہ کے راستے میں خرچ کرے اور خیر کماے۔ لیکن اس کو اس بات کا قانونی حق حاصل رہے گا کہ اپنی ضرورت سے زائد مال کو کاروبار میں لگائے اور اس کو ورثاً منتقل بھی کرے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی سرمایہ دارانہ نظام میں

مشاور ممکن ہے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو بھی ایک حد کے اندر رکھا ہے تاکہ یہ آزاد سرمایہ کاری، سرمایہ داری کی لعنت کی صورت اختیار کر کے انسانی معاشرے پر مسلط نہ ہونے پائے۔ اس ضمن میں اسلام نے جو عملی تدابیر اختیار کی ہیں ان کو ان کے فلسفیانہ پس منظر سمیت دو حصوں میں سمجھا جاسکتا ہے۔

الف : یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب آزادی (خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو) دی جائے گی تو کچھ اونچ نیچ لازماً پیدا ہوگی۔ دوڑ لگے گی تو یقیناً کچھ لوگ آگے نکل جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے۔ آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس فرق و تفاوت سے بھنا ممکن نہیں۔ آزادی خواہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو جب بھی آئے گی اس بات کا امکان بہر حال موجود رہے گا۔ چنانچہ اس کو کھلے دل سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسلام کے قانونی نظام معیشت میں اس بات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ معاشرے میں مالی فرق و تفاوت کو کم کیا جائے۔ اس کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے۔ اسلام نے ایک حد قائم کی ہے کہ جو لوگ اس سے اُدھر نکل جائیں دینے والے یا (Doners) ہیں اور اُدھر والے "لینے والے" یا (Recipients) ہیں۔ ان کو Haves شمار کریجیے اور اُن کو Have-nots دین کی اصطلاح میں وہ علی الترتیب

"صاحبِ نصاب" اور "میکین" کہلاتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ تقسیم بھی الٹ ٹپ (Arbitrary)

نہیں ہے۔ اسے آپ اپنے اختیار سے آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لائن ہے جو کھینچی جا چکی ہے جس کے پاس اتنے اونٹ ہیں اُدھر اور جس کے پاس نہیں ہیں اُدھر۔ اگر اس قدر سونا ہے تو اُدھر اور نہیں ہے تو اُدھر۔ اور اسی طرح جس کے پاس اتنی چاندی ہے اُدھر اور جس کے نہیں ہے اُدھر۔ اس تقسیم کے بعد وہ نظام زکوٰۃ قائم کیا کہ جس کے بارے میں واضح فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "تَوْخِذْ مِنْ اَغْنِيائِہُمْ وَتَرُدِّ اِلٰی فُقَرَاءِہُمْ" ان کے اغنیاء سے مال وصول کیا جائے گا اور ان کے فقراء کو دے دیا جائے گا۔ تاکہ معاشرے میں پیدا ہونے والی ناہمواری کا سدباب ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ بھوکے اور ننگے رہ جائیں اور ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں جبکہ کچھ لوگ اتنا سرمایہ جمع کر لیں کہ کیفیت وہ ہو جائے جس کے

لوگوں کے درمیان ہی گردش میں نہ رہ جائے جس کی ایک سادہ مثال ایک کروڑ پتی کی بیٹی کا لاکھوں روپے کا جیڑ لے کر دوسرے کروڑ پتی کے گھر جانا اور کسی امیر کے بیٹے کی ساگرہ پر امرار کا لاکھوں روپے تحائف کا انبار لگانا ہے۔ اس میں بظاہر سرباہ گھومتا ہے مگر صرف اغیار کے دائرے میں۔ یہ معاشی چکی صرف وہیں گھوم رہی ہے اور اس کا آٹا پھلنی سے چھن کر پخلے طبقوں تک نہیں پہنچ رہا۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ کسی معاشرے میں یا کسی ملک میں جو بھی ذرائع پیداوار اللہ نے تخلیق فرمائے ہیں ان سے جو کچھ بھی حاصل ہو، اس کی ایک منصفانہ تقسیم ہو۔ معاشرے کے تمام افراد پیداوار اور دولت سے متمتع ہوں اور گردش دولت صرف بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ

© rasailojaraid.com

میں جس مفہوم کی ادائیگی کے لیے "کنٹرولڈ کیپیٹلزم" کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں آجکل اس مفہوم کو Internally managed capitalism کے الفاظ سے ادا کیا جا رہا ہے۔ سرمایہ دار بھی اس بات کو جان چکے ہیں کہ ننگے اور عریاں کیپیٹلزم کا کوئی مستقبل نہیں۔ وہ تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم :-

دیارِ مغرب کے رہنے والوں خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لہذا خود کیپیٹلزم اپنے اندر کچھ نمایاں تبدیلیاں کر رہا ہے۔ اس کی بہت نمایاں مثال آپ کو برٹش سسٹم میں ملے گی۔ مثلاً جو لوگ کام پر نہیں ہیں ان کو نان ایملپمنٹ الاؤنس دیا جائے یا ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمے لے۔ چنانچہ آزاد معیشت بھی ہے کہ جو آگے نکل سکتے ہیں نکلیں۔ لیکن ہر شہری کے لیے اس کی بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ غور کیجیے کہ اسلام کے نظام میں یہ چیزیں چودہ سو سال پہلے آپکی تھیں۔ اس ذمہ داری کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس تاریخی جملے سے لگایا جاسکتا ہے جس میں آپ نے

© rasailojaraid.com

اس کے بارے میں بھی بازپرس ہوگی۔ انسان تو بہر حال اشرف المخلوقات ہے اس کا حق جانوروں سے مقدم ہے، اسلام آزادی دیتا ہے کہ کماؤ اور کھاؤ، جائز حدود کے اندر اندر خوب محنت کرو۔ کوئی آگے بڑھ جائے اور کوئی پیچھے۔ لیکن یہ معاملہ ایک حد کے اندر اندر رہے اور جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی ضمانت کے لیے زکوٰۃ اور عشر کا نظام قائم کیا گیا۔ کوئی چاہے تو اس کو اجتماعی انشورنس کا نام دے لے۔ اگرچہ اس میں ایک فرق ہے۔ انشورنس کسی بھی نوعیت کی ہو اس کو انسان اپنی کمائی میں سے خرچ کر کے کماتا ہے جبکہ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے جو انشورنس اسلام فراہم کرتا ہے اس میں Beneficiary کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ب، اسلام نے مساکین اور صاحبِ نصاب لوگوں کے مابین فرق و تفاوت کو کم کرنے کے لیے صرف زکوٰۃ کے نظام پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس آزاد سرمایہ کاری پر حلال و حرام کی وہ حدود و قیود قائم کی ہیں کہ جن کی موجودگی میں واقعتاً سرمایہ کاری "سرمایہ داری" نہیں بن سکتی۔ ذرا نگاہ ڈالیے ان اقدامات پر اور قرآن مجید کی حکمت بالغہ پر عرضِ عش کیجیے کہ بنیہر معاشیات کا کوئی عنوان قائم کیسے کیسی بنیادی اور اہم ہدایت دی ہیں۔

دُنیا میں ہمیشہ سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے معاشی نتیجہ نکلتا ہے ایک چھوٹا سا خانہ بچہ بھی اگر آپ لگائیں تو آپ کو بیس تیس روپے کا مال لگا کر بیٹھنا ہوگا۔ یہی حال بڑی دکان یہاں تک کہ کارخانہ اور مل بھی جو کچھ پیدا کرتے ہیں سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے پیدا کرتے ہیں۔ گو جدید ماہرین اقتصادیات خصوصاً سوشلسٹ مصنفین نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ سرمایہ بھی محنت ہی کی پیداوار ہے لیکن یہ بحث درحقیقت مُرعی اور اندھے کی نوعیت کی ہے کہ ان میں سے کون سی شے پہلے ہے۔

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ اسلام کے نظام معیشت میں زیادہ زور محنت

لے جتے اللہ الہ اللہ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی مایہ ناز تصنیف کا نام ہے

پر ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ تحفظ دیا گیا ہے جب کہ سرمائے کی حیثیت کم سے کم رکھی گئی ہے اور اس کے صرف اپنی ذاتی حیثیت میں Earning agent ہونے کو کم سے کم تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی بدترین صورت کہ :

۱۔ سرمایہ صرف سرمایہ ہونے کی حیثیت سے کمائی کا حق دار ہو۔

۲۔ وہ اپنا تحفظ بھی چاہے۔

۳۔ گھائے میں شریک نہ ہو۔

۴۔ اور نفع میں بھی ایک معین شرح لے رہا ہو۔

یہ چار عناصر سود یا ربو کے جزو لاینفک ہیں جسے اسلام نے حرام مطلق قرار دیا ہے۔ ان لغت کو جس طرح اسلام نے اپنے نظام معیشت میں ختم کیا ہے اور جس طرح اس کی جڑ کاٹی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں شراب اور بدکاری کے ارتکاب جیسے جرائم پر بھی وہ انداز اختیار نہیں فرمایا جو سود پر کیا گیا ہے۔ کوئی شخص اگر جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی غلطی کر بیٹھا ہے تو اس پر حد تو جاری کی جائے گی لیکن قرآن مجید میں اللہ کا جو غضب اور غصہ سودی کاروبار کرنے والوں پر بھڑکا ہے کسی اور پر نہیں بھڑکا۔ فرمایا کہ اگر تم سود کے لین دین سے باز نہیں آتے تو "فَاذْنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ" (البقرہ) تو سن لو کہ اللہ اور اس کے رسول کا تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور حدیث میں تو واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے سب سے بڑے رمز شاس حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ ہماری ذہنی سطح سے قریب تر ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا :

الرَّبُو سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَيَسْرُهَانِ يَنْكَحُ الرَّجُلُ امْرَاةً

(رواہ ابن ماجہ و بیہقی)

ربو (سود) کے ستر اجزاء ہیں یہ گناہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے ستر حصے کیے جا سکتے ہیں اور ان میں ہلکا ترین بھی اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔

یہ انداز بظاہر گھلتا ہے کہ آپ نے یہ انداز تعبیر کیوں اختیار فرمایا، لیکن جب

میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو بہت سے گناہوں سے طبعی نفرت ہے خصوصاً ہمارے ہاں ایک نام نہاد ”دیندار“ مگر اصلاً ”کاروباری“ طبقہ ہے۔ ان لوگوں کو نماز روزے سے بڑی دلچسپی ہے۔ حج کرنا تو گویا ان کا محبوب مشغلہ ہے اور دارالعلوم اور مساجد بظاہر قائم ہی انہی کے بل بوتے پر ہیں، شراب سے ان کو بڑی نفرت ہے اور اگر اس پرزنا کا اضافہ ہو جائے تو گویا قیامت آگئی۔ مگر سود سے ان کو کوئی نفرت نہیں اور وہ بڑے ذوق و شوق سے سودی کاروبار کرتے ہیں۔ لہذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میزانِ عدل میں تول کر ایک نسبت و تناسب قائم فرمایا ہے اور واضح فرما دیا ہے کہ اس کی اصل حیثیت کیا ہے یہ زنا کی بدترین صورت (یعنی ماں کے ساتھ زنا) سے بھی سترگنا زیادہ بھیانک ہے۔

بالکل اسی نوعیت کا ہے وہ انداز جو سورۃ الحجرات میں غیبت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے غیبت کرنے کو اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح ایک مُردہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا، جیسے چاہو فوج ڈالو، اسی طرح تمھارا جو بھائی موجود نہیں وہ بھی اپنی مدافعت سے قاصر ہے جیسے چاہو اس کی برائی کر لو۔

فی الجملہ ہمارے نظامِ شریعت میں اور احکامِ دین کے اس پورے سلسلے میں جو بدترین بُرائی قرار دی گئی ہے وہ سود ہے۔

اصل میں یہی وہ چیز ہے جس پر سرمایہ داری پروان پڑھتی ہے اور ہمارے

دین میں اس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔

I اب میں مختصراً بعض دوسری چیزوں کی نشاندہی کرتا ہوں جنہیں اسلام حرام مطلق قرار دیتا ہے :

سرمایہ جب اپنے بل بوتے پر مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے اور مارکیٹ میں اتار پڑھاؤ پیدا کرتا ہے، مثلاً ایک شخص سرمایہ کی بنیاد پر کبھی ایک دم بہت سا مال خرید کر قیمتیں بڑھا دیتا ہے اور مارکیٹ کو اونچا لے جاتا ہے اور کبھی ایک دم بہت سا مال (Release) پیل کر کے مارکیٹ کے بھاؤ گرا دیتا ہے تو یہ سرمائے کا کھیل بلکہ

ننگا ناچ ہے۔ مارکیٹ میں اس کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کو دین اسلام نے حرام مطلق قرار دیا ہے۔ مثلاً:

① ذخیرہ اندوزی (HOARDING)

اس سلسلے میں سب سے زیادہ زور اشیاء خورد و نیاز پر دیا گیا ہے کیونکہ یہ انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہیں۔ اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے باقی اشیائے ضرورت کو بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

”جس نے کھانے پینے کی چیز چالیس دن تک روک رکھی (بازار میں لوگ بے مگر وچ اس کو فراہم نہیں کر رہا، چاہتا ہے کہ قیمتیں بڑھ جائیں) تو وہ اللہ سے بری ہو گیا اور اللہ اس سے بری ہو گیا اللہ کا کوئی تعلق اس سے نہیں اور اس کا کوئی تعلق اللہ سے نہیں!“

② سٹہ (SPECULATION)

کچھ لوگوں کی ایک معاشی حیثیت متعین ہے اور وہ سٹہ کھیلتے ہیں اور بیٹھے بٹھائے مال کے خرید و فروخت کا چکر چلاتے رہتے ہیں حالانکہ وہ نہ بالفعل مال خریدتے ہیں اور نہ بیچتے ہیں اور نتیجتاً مارکیٹ میں آنے سے قبل ہی مال ہر منافع کی تہیں پڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تمام پیشگی فرضی سودے سرمایہ داروں کا ایک کھیل ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے دین میں جو مال موجود نہ ہو اس کا سودا نہیں ہو سکتا سوائے ایک استثنائی صورت کے جسے بیع سلم کہا جاتا ہے۔

③ انشورنس (INSURANCE)

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مختلف چیزوں کی حقیقت کو سمجھیں۔ بقول علامہ اقبال اے اہل نظر ذوقِ نظرِ خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

بعض چیزیں دیکھنے میں بہت خوشنما نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں کہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انہی میں ایک انشورنس ہے۔ ہم کسی درجے میں یہ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دین میں یہ شے حرام ہے۔ اس کی حرمت کی

حکمت سمجھیے کہ اس حرمت سے کس طرح سرمایہ کاری (جس کی اسلام میں اجازت ہے) کو سرمایہ داری بننے سے روکا گیا ہے۔

انشورنس کیا ہے؟

اول تو اس میں چانس والا جوئے کا پہلو ہے لیکن اس سے پہلے اس کی اصلیت ہی سرمایہ دارانہ ہے۔ اصل انشورنس تو وہ ہے جو بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں کی ہوتی ہے۔ ایک سرمایہ دار نے دس لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک کارخانہ بنایا فرض کیجیے وہ ایک ماہس کی فیکٹری لگاتا ہے۔ اس کا یہ کارخانہ آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی سیلاب آجائے یا کسی اتفاقی حادثہ میں آگ لگ جائے اور سارا کارخانہ جل کر خاک ہو جائے لیکن وہ سرمایہ دار اپنے سرمایہ کا تحفظ چاہتا ہے انشورنس کے ذریعے سے۔ لیکن وہ یہ تحفظ بھی اپنی جیب سے نہیں کرتا۔ اس کے لیے وہ جو بہیم (Premium) ادا کرتا ہے اس کو اپنے اخراجات میں داخل کر کے دیاسلامی کی لاگت (Cost) میں شامل کرتا ہے اور دیاسلامی کی ڈبیہ کی قیمت اگر ۲۵ پیسے ہے تو

اس میں ایک پیسہ یا کم و بیش وہ سرمایہ دار صارف (Consumer) سے اپنے سرمایہ کا تحفظ کے لیے وصول کر رہا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ قومی معیشت کے اعتبار سے تباہی ہو گئی، ملکی سطح پر دس لاکھ روپے کا نقصان تو ہو گیا لیکن وہ سرمایہ دار اس قومی نقصان سے لاتعلقی رہنا چاہتا ہے۔ وہ صارف کی کاسٹ پر اپنے سرمایہ کا تحفظ کرتا ہے اور اپنے مستقبل کا بھی۔ وہ یہ تحفظ عوام کی جیبوں پر بوجھ ڈال کر کرتا ہے۔ یہ ہے اصل حقیقت انشورنس کی۔ گویا یہ فی الحقیقت سرمایہ داروں کی ایک کوآپریٹو ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ صرف سرمایہ داروں کے سرمائے کا تحفظ ہے۔ اور ”کَيْ لَا يَكُونُ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ وَالْمَنْكُمِ“ کی جیتی جاگتی تصویر۔ یہ سرمایہ داری کی لعنت کو تقویت پہنچانے والے شے ہے۔ جس کی حرمت کا اسلام نے فیصلہ صادر فرما دیا ہے۔

II معیشت کے ناپسندیدہ طریقے اور وہ طریقے جن کے جائز اور ناجائز ہونے

لے لائف انشورنس کے حق میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے اس میں سے جوئے کا پہلو نکال دیجیے تو وہ اتنی سنت ہے جس میں ہر شخص کو سرمایہ داری کی حرمت کا پہلو بر حال ہے۔ جس اس کا قائل ہوں۔

کے بارے میں اختلاف ہے۔

اب تک تو میں نے وہ چیزیں بیان کی ہیں جو حرام قطعی ہیں۔ تھوڑا سا نیچے آئیے تو ہمارے دین میں ایک اور دائرہ ہے جس میں اسلام نے کچھ چیزوں کو یا تو حلال رکھا ہے یا یہ کہ ان کی حلت و حرمت میں اختلاف ہے لیکن رُوحِ دین کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہیں۔ ان سب کو میں ایک ہی گروپ میں لا رہا ہوں۔

الف: مضاربت :

ایک شخص محنت کر سکتا ہے دکان چلا سکتا ہے مگر اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور کسی دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے۔ اب یہ دونوں مل کر کام کر لیں ایک کی محنت دوسرے کا سرمایہ۔ اس صورت میں محنت اور سرمایہ کا امتزاج وجود میں آئیگا اور اس کا نام مضاربت ہے۔ یہ دین میں جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں جیسے مثلاً طلاق۔ اگر کسی کے پاس سرمایہ ہی اتنا ہے کہ جس پر خود اس کی معیشت کا دار و مدار چل سکتا ہے تو وہ خود دکان لگائے، محنت کرے اور رزقِ حلال کمائے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضروریات کے لیے کوئی اور ذریعہ موجود ہے اور وہ فاضل سرمایہ اپنے ایسے بھائی کو دے رہا ہے جو سرمایہ نہ ہونے کے باعث کسی اور کے سرمائے پر کام کرنے پر مجبور ہے لیکن بے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سرمائے کی بنیاد پر اس کی محنت میں حصّے دار بنتا ہے۔ یہ جائز تو ہے کیونکہ اگر کسی بھی درجے میں آزادی کو برقرار رکھنا ہے تو اس نظام میں یہ گنجائش تو رکھنا پڑے گی۔ لیکن اسلام اس کو بس مجبوراً جائز قرار دیتا ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک پسندیدہ چیز وہی ہے جس کا ذکر اخلاقی نظام کے تحت قُلِّ العفو کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ لیکن اس میں بھی دیکھیے کہ اسلام نے کس مضاربت کو جائز قرار دیا ہے۔ ہمارے ہاں جو

۱۔ امتزاج کی ایک صورت مشارکت بھی ہے کہ دو آدمی مل کر کاروبار کرتے ہیں دونوں سرمایہ بھی لگاتے ہیں اور دونوں محنت بھی کرتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت سرے سے ہے ہی نہیں۔

۲۔ اَبْغَضُ الْحِلَالِ عِنْدَ اللَّهِ الطَّلَاق (الحديث) "جائز کاموں میں المثلہ کے نزدیک سب سے بحدہ شے طلاق ہے۔"

مضاربین ہوتی ہیں ان پر قیاس نہ کیجیے۔ لفظ مضاربت کے اشتراک سے یہ نہ سمجھ لیجیے کہ اس نام سے جو کچھ ہے وہ جائز ہے۔ اسلام جس مضاربت کو جائز قرار دیتا ہے اس میں محنت کو پورا پورا تحفظ دیا گیا ہے۔ جبکہ سرمائے کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا۔ اگر نفع ہوگا تو محنت کرنے والے کو اس میں سے حصہ ملے گا، لیکن اگر گھٹا ہوگا تو اس کا کوئی بوجھ محنت کش پر نہیں پڑے گا۔ نقصان کا سارا بوجھ سرمایہ دار کو برداشت کرنا ہوگا۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھیے۔ قرآن مجید میں جہاں تجارت کا ذکر آتا ہے وہاں عَنْ تَرَاضٍ بَيْنَكُم (کہ وہ تجارت باہمی رضامندی سے ہو) کی شرط عاید ہے۔ آپ کو اس کا بھاد معلوم ہے آپ قیمت دے کر چیز خرید لیں گے اور معاملہ رضا و رغبت کا ہوگا لہذا وہاں یہ شرط پوری ہو جائے گی۔ لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص بالکل مجبور ہو کر قانونی طور پر تو رضامندی ہو گئی آپ کہیں گے کہ میں نے کب اس کو مجبور کیا تھا وہ خود میرے پاس آیا ہے کہ میرے پاس سرمایہ نہیں ہے تم مجھے سرمایہ دو۔ میں محنت کر لوں گا اور تمہیں اس میں سے حصہ دوں گا۔ کہنے کو تو رضامندی ہو گئی لیکن درحقیقت یہ مجبوری ہے کیونکہ اس کے پاس اپنا سرمایہ نہیں۔ اگر ہو تو کوئی کب پسند کرتا ہے کہ کسی اور کو اپنی محنت کے حاصل میں شریک کرے۔ چنانچہ مجبوری کا پہلو اس مضاربت میں موجود ہے جس کی وجہ سے اگرچہ یہ حلال تو ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔

ب۔ مزارعت :

اسی قبیل کی شے مزارعت ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے اور کوئی دوسرا اس پر محنت کر رہا ہے۔ اس مسئلہ میں فقہائے اُمت کے درمیان اختلاف ہے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم کی مزارعت حرام مطلق ہے Absentee Landlordism کا ان کی رائے میں اسلام میں کوئی امکان سرے سے موجود نہیں۔ بعض دوسرے فقہاء نے ان احادیث پر غور کرنے کے بعد

اس میں استحان اور مصالحِ مرسلہ کے اصول کے تحت کچھ گنجائشیں نکالی ہیں اور یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس دور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیتہً بدلنا ممکن نہ تھا۔ لہذا کچھ ناگزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مزارعت پر لفظ ربو کا اطلاق کیا ہے، کہ جب آپ نے حضرت رافعؓ ابن خدیج کو دیکھا کہ وہ ایک کھیتی کو سیंच رہے ہیں۔ آپ کے علم میں تھا کہ رافع کی اپنی کوئی زمین نہیں لہذا آپ نے ان سے تفصیل پوچھی۔ حضرت رافع نے بتایا کہ زمین فلاں شخص کی ہے اور محنت میں نے کی ہے اور یہاں سے باہر یہ شیعہ مقرر ہوتی ہے۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قد آن بیتما" یعنی تم کے ربو کا معاملہ کیا، ایک سودی کاروبار کیا۔ اور فرمایا کہ زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور جو خرچ تمہارا اس پر آیا ہے اس کی قیمت اس سے وصول کر لو۔ اس لیے کہ اس میں مالک کی محنت شامل نہیں ہو رہی ہے، وہ صرف زمین کی ملکیت کی بنیاد پر اپنے ایک بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے حصہ وصول کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے ہاں مزارعت کی جو شکلیں رائج ہیں اس میں پھر بھی مالک بیج اور بہت سی دوسری چیزوں میں شامل ہوتا ہے، یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لیے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں۔ ورنہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے کے قابل ہے۔ مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملۃً اتفاق ہے۔

III خرید و فروخت کے عام طریقوں پر قدغیں خصوصاً جو مال موجود نہ ہو اس کے سودے کی ممانعت۔

جو مال موجود نہ ہو اس کے سودے کی جو شکل بھی ہو وہ حرام

ہے مثلاً :

۱۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جب ہماری اکثریت امام ابو حنیفہ کی فضیلت بیان کرتی ہے تو ان کو امام اعظم اور سید الفقہاء قرار دیتی ہے اور ان کے بعض فتاویٰ کو درست ثابت کرنے کے لیے لڑی لڑی ہوئی کا زور لگایا جاتا ہے۔ "مجتہدین" میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا محضہ کے مصداق ایسے اہم معاملات پر ان کے فتوے کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

① ٹھیکے پر زمین دینا۔ مالک نے ایک وقفے کے لیے زمین کی قیمت وصول کر لی ہے۔ اب کاشت کار کو اس سے کوئی بچت ہوتی ہے یا نہیں، اس کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ گویا یہ تو کھلی ہوئی سود کی صورت ہے اس لیے یہ حرام ہے۔

② باغ میں پھل آنے سے قبل اس کا سودا کرنا بھی ناجائز ہے۔

③ یہ تمام ایڈوانس برنس (Advance Transactions) جو دنیا میں ہوتے ہیں

ان کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ سیدھی سادھی بیع وہ ہے کہ قیمت دو اور مال وصول کرو یا ایک ہاتھ سے چیز لو اور دوسرے ہاتھ سے دو۔ تبادلے کی صورت میں یہاں بھی کسی کی بھوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی یا کوئی اور مفساد پیش نظر نہ ہو۔ ایڈوانس برنس کے اس طریقے کے باعث Over Trading ہوتی ہے

ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں لیکن وہ پچاس ہزار روپیہ بیعاً نہ ادا کرے پچاس لاکھ کے سودے کر لیتا ہے تو اس سے سرمایہ داری کی لعنت جنم لیتی ہے۔ اس کو روکا گیا ہے کہ اگر تمہارے پاس پانچ لاکھ روپیہ ہے تو پانچ لاکھ ہی کا سودا کرو۔ اسلام میں ادھار کی صرف ایک صورت جائز ہے جس کو بیع سلم کہتے ہیں کہ ایک طرف سے پوری جنس یا قیمت ادا کر دی جائے اور دوسری طرف سے مال کی فراہمی یا ڈیلیوری کو موخر (Defer) کیا جاسکتا ہے لیکن آجکل جزدی ادائیگی کے جتنے بھی سودے کیے جا رہے ہیں ان کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

④ آرٹھت :

اسی کے ضمن میں آرٹھت آتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

”لا یبیع الحاضر للبادی“

کوئی شرکاء آدمی باہر کے آدمی کا مال فروخت نہ کرے۔

یہ آرٹھتی جو منڈیوں میں اڑے جا کر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ مال جو یہ بیچتے ہیں ان کا اپنا نہیں ہوتا اور کئی دفعہ مال موجود بھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنے اڑے کی وجہ سے فروخت کنندہ اور گاہک دونوں سے کمیشن وصول کرتے ہیں۔ ایک شخص

نے گندم بوئی ہے تو وہ خود فروخت کرے اور اگر اس شہر والے کے پاس گندم کی قیمت موجود ہے تو پہلے پوری گندم خرید لے اور پھر اپنے پاس سے اسے فروخت کرے۔

اس اعتبار سے دیکھیے کہ یہ کس قدر دُور رس ہدایت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ورنہ ہمارے ہاں اجناس کی قیمتوں کو بڑھانے والے اور گوشت کی قیمتوں کو چڑھانے والے یہ آرہتی ہیں۔ لہذا اسلام نے ان کے عمل و عمل کو کم کیا ہے۔

(MIDDLE-MAN) **مڈل مین**

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اسلام نے اپنے معاشی ڈھانچے میں مڈل مین کے عمل و دخل کو حق الوسع کم کیا ہے۔

تقسیم دولت کے لیے اقدامات

- ۱۔ وراثت : اسلام کا قانون وراثت ارتکاز دولت کو ختم کرتا ہے۔ ایک شخص کی جائیداد کا وارث کوئی دوسرا (ایک ہی شخص) نہیں بنتا بلکہ وہ جائیداد اور سرمایہ بٹ کر بہت سے لوگوں کو ملتا ہے۔
- ۲۔ انفاق فی سبیل اللہ اور نفلی صدقات۔

انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانا

جس طرح اسلام دولت کمانے کے لیے کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا بالکل اسی طرح انسانی کمزوریوں کو Exploit کر کے دولت کمانے کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً

① جنسی جذبہ (SEX)

جنسی جذبہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ میں نے سیکس کو انسان کی کمزوری قرار دیا ہے۔ اس لیے اسے بھی انسانی شرمگاہوں کو "فرج" کہا ہے۔ فرج کے لغوی معنی

ہیں اندیشے کی جگہ۔ فیصل میں جہاں دراڑ ہے وہ فرج ہے جہاں سے غنیم کے در آنے کا یعنی حملہ آور کے اندر داخل ہونے کا موقع ہو۔ لہذا انسان کے اس جنسی جذبہ کو مشتعل کر کے کمانے کو حرام مطلق قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح آپ کا یہ ساری فلم انڈسٹری اور قحبہ گری کا کاروبار اور فحش لٹریچر کی طباعت و اشاعت اور خرید و فروخت کا دھندا ختم ہو جاتا ہے۔

② شراب پر پابندی

اسی طرح شراب بھی حیوانی جذبات کو مشتعل کرتی ہے چنانچہ اس کے پینے پر اسلام مطلق قرار دیا گیا ہے۔

③ فضول خرچی

انسان اکثر و بیشتر دولت کمانا ہے تعیش کے لیے، لیکن اسلام میں عیاشی کے تمام دروازے بند ہیں۔ قرآن مجید میں تنذیر (فضول خرچی اور نمود و نمائش) پر حصر کر کے روکا گیا ہے۔ اور گویا اس طریقے سے بھی اسلام نے دولت کے ساتھ انسان کی محبت (Attachment) کو کم کر دیا ہے۔ تو پھر کوئی شخص سرمائے کو کیوں چاہے گا۔

قصہ مختصر سرمایہ داری کی لعنت پر اسلام کا حملہ کسی ایک جانب سے نہیں بلکہ مختلف اطراف سے ہے۔

قویہ ہے وہ نقطہ عدل، کہ آزادی بھی برقرار رہے یعنی اسلام میں جبری مساوات نہیں، لیکن اس بات کا معقول انتظام ہے کہ عوام کے درمیان معاشی ناہمواری ایک حد سے بڑھنے نہ پائے۔ رہی وہ جبری اور کلی مساوات جس کی تعلیم سوشلزم دیتا ہے تو وہ دُنیا میں آج تک کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اور فطرتِ انسانی سے بالکل بعید ہے۔

دو گنجائشیں

① ایک طرف اسلام نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ اگر کسی وقت زکوٰۃ

اور عشر کی حاصل شدہ آمدنی یا خمس اور اس نوعیت کے دوسرے محصولات مثلاً فے وغیرہ کہ جن کے مصارف وہی ہیں لیکن اگر کسی وقت ایمر جنسی کے حالات میں ان ذرائع سے حاصل شدہ رقوم کفالت عامہ کے لیے کافی نہیں ہوتیں تو اسلام غرباء اور مساکین کی وکیل عام اسلامی ریاست کو حق دیتا ہے کہ وہ زکوٰۃ وغیرہ سے زائد جبراً بھی وصول کرے۔ یعنی یہ حق ملکیت اس طرح کی (Sanctity) اور اس نوع کا تقدس نہیں رکھتا کہ جو ایک سرمایہ دارانہ نظام میں اس کو حاصل ہوتا ہے۔

۲ قومیاں (NATIONALISATION)

پیداوار کو پبلک سیکٹر میں رکھتے ہوئے عدل کا تقاضا پورا نہ ہونے پاتے تو اسلامی ریاست میں اس ذریعہ پیداوار کو قومیاں (Nationalise) کی گنجائش بھی موجود ہے۔ کیونکہ اصل شے عدل ہے اگر عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تو کسی بھی صنعت وغیرہ کو قومیاں میں کوئی قدرغن اسلام کی رو سے نہیں ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے۔ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں اور دجلہ اور فرات کی سرزمین اور شام اور فلسطین کے انتہائی زرخیز علاقے اور سبزہ زار مسلمانوں نے فتح کیے تو مطالبہ کیا گیا کہ ان کو مجاہدین کے اندر تقسیم کر دیا جائے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس پر غور کیا اور یہ بڑا نزاعی مسئلہ بنا رہا۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی، مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقد ہوئے۔ دونوں طرف سے بھرپور دلائل دیے گئے لیکن آخر کار حضرت عمر کے اجتہاد پر اجماع ہوا کہ ایسا کرنے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، سب زمینیں اسلامی ریاست کی ملکیت (سیٹ لینڈ) ہوں گی اور اس پر کام کرنے والے (Tenants) مزارعے کی حیثیت سے برقرار رہیں گے۔ وہیں کے لوگوں کو حقوق دیے گئے اگرچہ وہ ملکیت کے حقوق نہیں تھے لیکن ایک نوع کی موردی مزارعت تھی کہ وہ ان میں زراعت کریں گے اور اسلامی ریاست ان سے لگان یا خراج وصول کریگی ذہن میں رکھیے کہ اگر خدا نخواستہ اس موقع پر حضرت عمرؓ کا یہ اجتہاد سامنے نہ آتا تو دُنیا

بے سبب اسلامی ریاست کے محاصل ہیں اور ان سب کا بڑا حصہ وہ ہے کہ جو Have-nots کی کفالت کا ذریعہ بنے

اسلامی ریاست میں Taxes کی اہمیت ہے۔

میں بدترین جاگیرداری نظام اسلام کے ذریعے سے رائج ہو جاتا۔ کیونکہ عراق اور شام کے فاتحین لاکھوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں تھے اور اگر وہ تمام زمینیں ان میں تقسیم کی جاتیں تو وہ سب بڑے بڑے جاگیردار بن جاتے۔

آخری بات

میں نے یہ دو نظام آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ اسلامی ریاست میں یہ نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام کی برکات کا ظہور صرف اس قانونی نظام سے نہیں ہوگا۔ میں واضح کر دوں کہ جب تک معاشرے میں بالفعل الحسنہ اور بالفعل الحسنہ کا جو اثر ہے اور روحانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں، یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ ایک ہمارا معاشرہ ہے جس میں اصل قدر دولت کی ہے۔ جس کے پاس دولت و سرمایہ ہے وہ صاحب عزت ہے۔ اس سے بڑے سے بڑا نیک آدمی بھی بھک کر ملے گا۔ ذرا چمٹم تصور میں لائیے، شیخ احمد سرہندی، یا سلطان الہند نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہما کو جو قرآن کی ایمانی تعلیمات کا مظہر اتم ہیں ان کو دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں ہے وہ دنیا کی کسی شے کی ملکیت حاصل کر کے بھی خیر کرنے والے نہیں۔ دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کو بھت اگر ہے تو کافی ہے۔ اس پر مزید حصول کی ان کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ان کی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ دولت کے انبار اور شاہی سلطنت کا جاہ و جلال ان کو متاثر نہیں کرتا اور وہ عمل نمونہ ہیں ”قل العفو“ کی قرآنی تعلیم کا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو Inspire کرتے ہیں اور ان سے معاشرے میں اقدار کا تعین ہوتا ہے جن کی موجودگی میں وہ ایمانی حقیقت سامنے رہتی ہے کہ اصل مسئلہ ”معاش“ کا نہیں دنیا کی خاطر دوڑ دھوپ کا نہیں بلکہ ”معاد“ کا ہے، آخرت کا ہے۔ اصل چیز دولت و ثروت نہیں، نیکی اور عمل صالح ہے۔ اللہ کی محبت، اس کی بندگی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کی سنت کا اتباع ہے۔ اور اگر روشنی کے یہ مینار بالفعل موجود نہ ہوں تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ صرف قانونی نظام سے اسلام کی برکات کا ظہور کبھی نہیں ہوگا۔

اس بات کو ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھیے کہ معاشرے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی مثال کو زندہ رہنا چاہیے۔ ہمیں اصحاب صفہ کا فقر سامنے رکھنا چاہیے کہ ان کے پاس لنگوٹیاں تھیں تو اتنی کہ سجدے میں جاتے ہوئے ان کو اندیشہ ہوتا کہ کہیں ان کا ستر نہ کھل جائے، پیچھے والے ان کا تنگ نہ دیکھیں۔ منتظر رہتے کہ جب سب لوگ سجدے میں چلے جائیں تو وہ سجدے میں جائیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے سب کچھ تچ دیا تھا اللہ اور اس کے رسول کے واسطے۔ انہیں میں سے ہیں حضرت ابوالدرداء، حضرت انس بن مالک، حضرت مقداد، حضرت ابوہریرہ اور انہی میں ہیں حضرت ابوذر بھی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اگر معاشرے میں بالفعل وہ لوگ موجود نہ ہوں کہ جن کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ لوگ بھی ہیں کہ ہمیں رشتہ کرنا چاہیں تو کوئی انہیں رشتہ نہ دے کسی کی سفارش کرنا چاہیں تو کوئی ان کی بات ہی نہ سنے۔ لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ کسی بات پر اگر وہ اللہ کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کی لاج رکھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پیکر محسوس کے خوگر انسان اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کو دیکھیں اور پھر ان میں جذبہ بیدار ہو قربانی کا خدا پرستی کا سادگی کا۔

آخر میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دین کل کی حیثیت سے ایک وحدت (Organic whole) ہے ہم نے اپنی سہولت کے لیے اس کے حصے بخرے کر لیے ہیں جو چیزیں طبیعت پر گراں گزریں ان میں حیلوں کی چابی لگا کر حلت و جواز کے لیے کہیں نہ کہیں سے کوئی راستے نکالے اور اب جو نتیجہ اس سے نکلا ہے آپ اس کے اوپر صرف لیبل بدل کر عوام کو یہ باور کرانا چاہیں کہ اسلام آگیا ہے تو یہ اسلام کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہوگی۔

ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں آج وہ تقاضے یکسر بدل چکے ہیں (کسی دور میں امتحان اور مصالحہ مسئلہ کا کسی ایک طرف رخ تھا تو آج دوسری طرف رخ ہے آج ضرورت ہے کہ اجتہاد کر کے اسلام کا پورا نظام جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی کلیت (Totality) کے ساتھ لوگوں کے سامنے لایا جائے کہ یہ ہے اسلامی نظام۔ اگر نافذ کرنا ہے تو اس کو پورا کا پورا نافذ کرنا ہوگا اور اسی کی ایک



تَحْفَظُهُ وَتُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

سرمایہ اور محنت

محترم صدر مجلس اور معزز خواتین و حضرات! آج میں اس مجلس میں خطاب کرتے ہوئے کچھ دقتیں پیش کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ اگرچہ میں قرآن مجید کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور اس اعتبار سے مجھے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں قرآن مجید کی راہنمائی پیش کرنے کا اہل ہونا چاہیے۔ تاہم یہ ٹیکنیکل مسئلہ سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔ واقعتاً دورِ جدید کے مشکل اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ بلکہ اس کو اگر تقریباً لائیکل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اس امر سے کہ مجھے اس میدان میں کبھی کوئی عملی تجربہ نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک طرف میں معروف معنی میں محنت کش بھی نہیں اور دوسری جانب سرمایہ دار تو کیا سرمایہ کار بھی نہیں ہوں، لہذا اس کوچے میں میری حیثیت عملی اعتبار سے بالکل فوارد کی سی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محترم بہن صبیحہ شکیل صاحبہ اور محترم سردار صاحب نے میرے لیے مزید دقت پیدا کر دی یہ فرما کر کہ وہ تو اس اجلاس میں اصلاً میری تقریر سننے کے لیے آئے ہیں۔ بعض دوسرے اصحاب نے بھی اصل راہنمائی کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال کر میری ذمہ داری میں اضافہ کر دیا ہے۔ لہذا میں پوری کوشش کروں گا کہ اس موضوع پر دین کا جو بھی تھوڑا بہت فہم مجھے حاصل ہے اس کی روشنی میں ان مسائل کا ممکنہ حل آپ کے سامنے رکھوں۔ بیدہ التوفیق و علیہ التکلیف۔

ہمارے ہاں بعض اصطلاحات

بہت غلط استعمال ہوتی ہیں۔ آج

آجرا اور اجیر نہیں آجرا اور مستاجر

اور اجیریں کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی اُجرت پر کام کرنے والا۔

اُجرت پر کام کرانے والے کے لیے اصل اصطلاح ”متاجر“ ہے۔ اسی قبیل کا ایک لفظ ”متوفی“ ہے جس کے اصل معنی ہیں وفات دینے والا۔ یعنی الشہ، نہ کہ جو فوت ہو رہا ہے جس کے لیے اصل لفظ ”متوفی“ ہے۔ ایسا ہی ایک لفظ ”منویہ“ ہے جس کے معنی ہیں ”اغوا کرنے والی“ جبکہ اغوا کی جانے والی ”منوۃ“ ہے تو متاجر وہ شخص ہے جو کسی سے اُجرت پر کام لے رہا ہو۔ اور آجر ہے وہ شخص جو اُجرت پر کسی کے ہاں کام کر رہا ہو۔

چونکہ مقالے کا اصل موضوع ہے ”اسلام میں محنت کا تصور۔“

محنت یا عمل

اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ محنت پر بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ یہ لفظ اگرچہ عربی زبان ہی کا ہے مگر نہ قرآن مجید میں اس معنی میں استعمال ہوا ہے نہ حدیث میں۔ یہ لفظ موجودہ فصیح عربی میں یہ اس معنی میں مستعمل ہے۔ قرآن حدیث کی اصل اصطلاح ”عامل“ ہے۔ یعنی عمل کرنے والا یا محنت کرنے والا۔ پھر دوسرا لفظ وہی آجریا ابیر استعمال ہوتا ہے۔

اس موقع پر یہ وضاحت مناسب ہوگی

قرآن مجید میں کمائی کا اصل تصور

حدیث میں بہت کم راہنمائی موجود ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی رُو سے انسان کی اصل کمائی نیکی یا بدی کی ہے، چنانچہ اس میں اصل زور ”کسبِ خیر“ کی ترغیب اور ”کسبِ شر“ سے اجتناب پر ہے یعنی قرآن کا اصل Emphasis معاش پر نہیں بلکہ مُعاد پر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سوائے ایک آدھ استثنائی مثال کے ”کسب“ کا لفظ قرآن مجید میں رزق کے لیے استعمال ہی نہیں ہوا۔ الغرض از رُوئے قرآن انسان کی اصل کمائی وہ خیر و شر یا بھلائی یا بُرائی ہے جو وہ آخرت کے لیے کما رہا ہے، یہ اصل کسب ہے۔ اس کے برعکس رزق کھیلے قرآن مجید کی اصل اصطلاح ”فضل“ ہے یعنی قرآن جو تصور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ نہیں بلکہ فضلِ خداوندی ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ قارونیت ہے کہ انسان اس مغالطے یا زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جو دنیوی ساز و سامان یا مال و متاع اسے حاصل ہے وہ اس کا اپنا پیدا کردہ ہے جیسے کہ قارون نے کہا تھا کہ اُوْتِیْتُہُ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدَیْ یعنی یہ سب کچھ مجھے اپنے علم کی وجہ سے حاصل ہوا ہے گویا یہ میرے علم و فہم، میری ذہانت و فطانت، میری پیش بینی و پیش بندی میری بدلائنگ

اور فرسائٹ (Foresight) کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید اس کی نفی کرتا ہے اس کی تعلیمات کی دُور سے محنت انسان ضرور کرتا ہے مگر جو کچھ اس کو ملتا ہے وہ سر اس اللہ کا فضل ہے نہ کہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ۔ اسلام کے اخلاقی نظام کے لیے اصل بنیاد یہی تصور فراہم کرتا ہے جبکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اصل بنیاد ہے "قانونیت"۔

حدیث شریف میں محنت یعنی مزدوری اور عمل پر یعنی انسان کے خود اپنے ہاتھ

محنت کا ذکر حدیث نبوی میں

سے کام کرنے کی بڑی عظمت و فضیلت وارد ہوئی ہے۔ مثلاً بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مَا بَعَثَ اللَّهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ فَقَالَ اصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ قَالَ: "نَعَمْ كُنْتُ ارْعَى عَلَى قَرَارِيطٍ لِّأَهْلِ مَكَّةَ"

یعنی اللہ نے کوئی نبی بھیجتا نہیں فرمایا جس نے اُہرت پر بھیڑیں نہ چرائی ہوں۔ صحابہؓ نے (متحیر ہو کر) سوال کیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے بھی یہ کام کیا ہے؟ اس کا جواب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ ہم سب کے لیے بہت اہم ہے، اس لیے کہ اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تواضع و انکسار بھی نمایاں طور پر جھلک رہا ہے۔

"میں تو چند قراریط کے عوض (چند ٹکوں کے عوض) مکہ کے لوگوں کے جانور چرایا کرتا تھا۔" معلوم ہوا کہ اُہرت یا مزدوری پر دوسروں کے لیے کام کرنا ہرگز باعثِ ندامت یا موجبِ شرم نہیں ہے۔ اس لیے اگرچہ یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ جو شخص خود اپنے سرمائے سے کام کر رہا ہو خواہ وہ چھابڑی ہی لگاتا ہو اس کے لیے کسی احساسِ کمتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جبکہ انسان کسی اور کے لیے اُہرت پر کام کرنے میں یقیناً عار محسوس کرتا ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے فرمایا کہ میں خود اُہرت پر دوسروں کیلئے کام کرتا رہا ہوں۔ لہذا یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ ہرگز ایسی بات نہیں ہے جس پر انسان کسی بھی درجے میں ندامت یا شرم محسوس کرے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُہرت پر کام کرنے کا ثبوت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیتِ اجیر

قرآن مجید سے ملتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام پورا صحرائے سینا پیدل عبور کر کے "ماریدین"

یعنی مہین کی بستی کے باہر کنویں پر پہنچے تو قرآن مجید نے ان کی اس وقت کی بے چارگی اور دنیوی اعتبار سے بے وسیلہ ہونے کی کیفیت کا نقشہ کھینچنے کے لیے ان کی دعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں کہ رَبِّ ارْحَمْنِي مَا كُنْتُ لَكَ (اَلْحَيُّ مِنْ خَيْرٍ فَحَقِّقْ) (القصص) ”پروردگار! جو خیر بھی تو میری بھولگی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں“ یعنی میری حالت اس فقیر و مسکین کی ہے جسے ایک پیسہ بھی دیا جائے تو وہ اسے نہیں ٹھکراتا بلکہ شکر یہ کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ تو یہیں وہ الفاظ جو اللہ کے ایک جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلے۔ وہاں جب اللہ تعالیٰ نے یہ صورت پیدا فرمادی کہ شیخ مدین کی صاحبزادیوں نے ان کی جس جہانی قوت اور اخلاقی عصمت و عفت کا پچھتم سر شاہدہ کیا تھا اس کی بنا پر انھوں نے اپنے والد سے سفارش کی کہ يَا أَبَتِ اسْتَأْذِنُكَ اَنْ خَيْرٌ مِّنْ اسْتِأْذِنْتُ الْقَوِيَّ الْاَمِيْنَ (القصص) یعنی اباجان! بہترین شخص مجھے آپ اجازت پر کام کرنے کے لیے رکھیں قوی بھی ہونا چاہیے اور امین بھی، اور دونوں صفات اس شخص میں موجود ہیں۔ اور شیخ مدین نے آگے بڑھ کر اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کے نکاح کی پیشکش حضرت موسیٰ کو کر دی تو آٹھ یا دس برس کی مزدوری ان کا مہر قرار پایا اور حضور کا ارشاد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصمت و عفت کی حفاظت اور اپنا ہیٹ بھرنے کے لیے آٹھ یا دس سال مسلسل مزدوری کی۔

”اِنَّ مَوْسٰی اَجَرَ نَفْسَهُ ثَمَانِ سِنِيْنَ اَوْ عَشْرًا عَلٰی عَقْدَةٍ فَرَحَهُ و طَعَامُ بَطْنِهِ“ رواہ احمد و ابن ماجرہ۔

حضرت داؤد اور عملید | اسی طرح بخاری ہی کی ایک اور حدیث کا حوالہ بھی یہاں بے عمل نہ ہوگا: ”عَنْ

مُعَاذِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلٍ يَدِهِ وَكَانَ نَبِيُّ اللَّهِ دَاوُدَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلٍ يَدِهِ“

(ترجمہ) کسی شخص نے اس سے بہتر روزی نہیں کھائی جس نے اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کھائی اور اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کاتے تھے۔

ناصر الدین محمود اور اورنگزیب عالمگیر | اور یہی بات ہمیں اپنے ماضی قریب کی روایات میں بھی نظر آجاتی ہے

ناصر الدین محمود اور اورنگ زیب جیسے بادشاہ اسی برصغیر میں گزرے ہیں جنھوں نے شاہی خزانے سے کوئی استفادہ کرنے کی بجائے خود محنت کر کے اپنی گزر اوقات کا سامان مہیا کیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ باتیں سطحی نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ اگر یہ باتیں ہماری فکر و سوچ میں سرایت کر جائیں تو ایک عظیم انقلاب واقع ہو جائے۔

اب آئیے اس موضوع پر دینی تعلیمات

اجرت کی ادائیگی میں عجلت

کی جانب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کے حقوق کے سلسلے میں دی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ابن ماجہ کی وہ مشہور حدیث آتی ہے جس میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہما (رضی اللہ عنہما) ہیں۔ یعنی اوتوا الاجیر اجرہ قبل ان یحفت عرقہ ۱

(ترجمہ) ”مزدور کو اس کی اجرت ادا کر دو اس سے پہلے کہ اس کا پسینہ خشک ہو“

اور دوسری حد درجہ جامع حدیث وہ ہے جو ماتحتوں کے ساتھ حسن

ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک

سلوک کے سلسلہ میں امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت معمر بن سوید سے روایت کی ہے۔ جس میں اصل واقعہ تو حضرت ابوذر غفاری کا بیان ہوا ہے لیکن ضمناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل اور دائمی ہدایات بھی نقل ہو گئی ہیں۔

حضرت معمر ابن سوید بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ کو ان کے ایک غلام کے ساتھ دیکھا کہ دونوں نے بالکل ایک ہی طرح کا حلقہ پہن رکھا تھا اس پر انھوں نے (حضرت معمر نے) پوچھا: ”آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ تو اس پر حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو گالی دی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت سرزنش فرمائی اور ارشاد فرمایا: ”ہم اخوانکم جعل اللہ تحت ایدیکم“ یعنی یہ تمھارے ہی بھائی ہیں، انسان ہیں، آدم اور حق کی نسل سے ہیں۔ اللہ نے انھیں تمھارے ماتحت کر دیا ہے۔“

اس کے بعد آپؐ حکم دیتے ہیں: ”فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ ممّا

يَاكُلْ وَلْيَلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تَكْفُرْهُمْ مَا يَنْبَغُ لَهُمْ فَاَنْ كَلَفْتُمْهُمْ فَاَعَيْنُوهُمْ" جس شخص کے ماتحت اللہ نے کسی اور شخص کو کر دیا ہو تو اسے چاہیے کہ جو کھانا وہ خود کھاتا ہے اسے بھی کھلائے، جو خود پہنتا ہے اسے بھی پہنائے۔ ان پر اتنا بار نہ ڈالو جس سے وہ دب کر رہ جائیں اور اگر ایسی مشقت ڈالنی لازم ہی ہو جائے تو خود بھی شریک ہو جاؤ اور ان کی مدد کرو۔

سوال کی مذمت اور محنت مزدوری کی ترغیب

یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح

سوال کرنے کی بجائے محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے کی ترغیب دلائی ہے وہ بھی پیش نظر رہے: لَانْ يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ أَحْبَلَةً شِمَ يَأْتِي الْجَبِلَ فَيَأْتِي بِجَزْئَةٍ مِنْ حَطِيبٍ عَلَى ظَهْرِهِ فَيَبْعُهَا فَيُفْلِدُ بِهَا وَجْهَهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ عَطْوَهُ أَوْ مَنَعُوهُ (بخاری عن زبیر بن العوام) ”تم میں سے کسی شخص کا رسی لے کر پہاڑ پر چلا جانا اور پھر لکڑیوں کا گٹھہ بیٹھ پر لاد کر بیچنا اور اس طرح اپنے چہرے کو (یعنی عزت نفس) بچانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی (انسان) سے سوال کرے اور وہ چاہے تو اس کو کچھ دے دے اور چاہے تو خالی ہاتھ لوٹا دے۔“

تو یہ ہیں وہ اصول جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماتحتوں کے بارے میں وضع فرمائے ہیں اور یہی ہیں وہ اخلاقی تعلیمات کہ جب تک وہ کسی معاشرے میں بالفعل موجود نہ ہوں تو محض کوئی خشک قانونی ڈھانچہ، خواہ اس کی کتنی ہی پیروی کیوں نہ کر لی جائے، معاشرے میں وہ برکات پیدا نہیں کر سکتا جو اسلام کی منشا ہیں اور جن کی ہم توقع رکھتے ہیں۔

اب میں اصل مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کیونکہ ایک تو اس تعلق نظام اقتصادی کے ساتھ ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کوئی الگ تھلگ مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسانی اجتماعیات کے تمام پہلو یعنی سماجی، سیاسی اور معاشی مل کر ایک ناقابل تقسیم وحدت بنتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کر کے اس پر غور نہیں کیا جاسکتا۔ ایک فلسفہ زندگی اور نظریہ حیات کی بنیاد پر جو نظام حیات وجود میں آئے گا اس کا اپنا ایک سماجی نظریہ ہوگا اور اسی کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ایک معاشی

نظام وجود میں آئے گا اور اسی نوعیت کا سیاسی ڈھانچہ بھی ترتیب پائے گا اور سب مل کر ایک Organic whole بن جائیں گے لہذا ان میں سے کسی ایک جزو کو نکال کر اس کی کسی اور نظام کے ساتھ پیوندکاری ناممکن العمل فعل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جو اصطلاحات مستعمل ہیں مثلاً اسلامی جمہوریت اور اسلامی سوشلزم، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اسلام کے ایمانیات، عبادات اور اخلاقیات لے کر دوسرے نظام ہائے زندگی کی عملی تشکیل کے مابین پیوندکاری کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی اصل مغالطہ ہے۔ اسلام کی بنیاد اپنے ایک نظریے پر ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ اس جڑ پر اگر تنا کھڑا ہوگا تو اس سے نکلنے والی تمام شاخیں باہم مربوط ہوں گی لیکن اگر وہ جڑ کمزور ہو یا اس جڑ کا بحیثیت جڑ سرے سے وجود ہی نہ ہو تو کسی بھی مصنوعی طریقے سے پیوندکاری کر کے اسلام کی ریاست حاصل کی جاسکتی ہے۔

خدا اور اس کے رسول پر اس یقین کے ساتھ ایمان
ایمان کیا ہے کہ جو کچھ اللہ نے فرمایا اور جو راہ اس کے پیارے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی اس پر چلے بغیر اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی نہیں اور اس بات کا یقین کہ آخرت میں ہمارے عمل کا نیکی اور بُرائی کی صورت میں بدلہ ملے گا یہ یقین ہی ایمان کی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہماری یہ دنیوی زندگی ہی حرفِ آخر نہیں بلکہ اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے اور انسان کا اصل مسئلہ بعد الموت زندگی سے متعلق ہے۔ رہی اس دنیا کی ناپائیدار زندگی، تو یہ فانی ہے عارضی ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں، اور اگر کچھ ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ایمان کی یہ دو بنیادیں قرآن مجید کی اس ایک آیت میں سمیٹی ہوئی ہیں: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ کٰجِعُوْنَ۔ (اللہ ہی ہمارا مبداء و معاد ہے، ہم اس کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں) گویا! یہ ایک سفر ہے۔ جب فی الواقع ایمان کی یہ دو بنیادیں قائم ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "کن فی الدنیا کانت غریباً و عابراً سبیلاً" الحدیث کے مصداق ایک "اجنبی" یا "راہ چلتے مسافر" کی طرح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے راہ چلتے مسافر کو اس راہ گزر سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے مومن کو بھی اس دنیا سے اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے۔

اسلامی نظام کا وجود | اس وقت دنیا میں بالفعل تو دو ہی نظام ہائے معیشت موجود ہیں یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت

دہا اسلام کا نظام معیشت، تو وہ دنیا کی ایک ایچ زمین پر بھی بالفعل قائم نہیں ہے اس کا وجود تو صرف ہمارے ذہنوں میں ہے یا ہماری زبانوں کی نوک پر یا اسی قبیل کی چیز ہے قلم جس تک یہ تصور محدود ہے۔

اسلام بمقابلہ اشتراکیت و سرمایہ داریت | یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اگرچہ اشتراکیت (Communism)

اور سرمایہ داریت (Capitalism) دونوں بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک مشرق ہے تو دوسرا مغرب، لیکن اسلام کے مقابلے میں ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ یہ آپس میں تو وسط اور وسط ہیں لیکن اسلام کے مقابلے میں اپنے فکری پس منظر کے ساتھ ایک ہی تنے کی دو شاخیں ہیں۔ اسلام جہاں مادیت کے مقابلے میں روحانیت اور اس دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی دعوت دیتا ہے یہ دونوں نظام صرف اور صرف مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہیں۔۔۔ یہ فلسفہ مادیت ہی تھا جس نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادیت (Dialectical materialism) کی شکل اختیار کر لی اور Communism وجود میں آیا۔

اسلام کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی ہی قائم کردہ بنیادوں پر اپنے مکمل ڈھانچے میں قائم ہو سکتا ہے اور کسی قسم کی پیوندکاری قبول نہیں کرتا۔ لہذا جب تک وہ نظریاتی بنیاد استوار نہ ہو اسلامی نظام کے ڈھانچے کا خیال گاڑی کے آگے گھوڑا باندھنے کے مترادف ہوگا۔ پہلے نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے اس لیے کہ اسلام تو ”ایمان“ ہی کی بنیاد پر قائم ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی اور جڑ یا بنیاد پر اس کے قیام کا تصور ہی بے کار ہے۔

اسلام کی متذکرہ بالا اساس یعنی اسلام میں عدل و قسط کی اہمیت | ایمان کو استوار کرنے کے ساتھ ساتھ

اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ اسلام نے عدل و قسط کے قیام کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے۔ شریعت، انزال کتب اور بعثت رسل کا مقصد نیز دین کا پورا ڈھانچہ

ان سب کا مرکزی خیال قیام عدل و قسط ہے یعنی عدل و انصاف پر مبنی ایک نظام حیات کا قیام گویا اسلام و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قَائِمًا بِالْقِسْطِ (انصاف کا قائم کرنے والا) بھی آئی ہے۔ اس کے علاوہ ارشاد خداوندی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ
بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ (النساء) والے اور اللہ کے گواہ بنو۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ
لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ۔ (المائدہ) اے اہل ایمان! اللہ کے گواہ بنو تاکہ عدل و انصاف قائم ہو۔

یہ ایک ہی بات کو دو پرایتوں میں بیان کیا گیا ہے لیکن اس خوب صورت انداز میں کہ روح و جد کر کے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ فرمایا :

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا
مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ
بِالْقِسْطِ۔ (الحمد) ہم نے اپنے رسول بھیجے بیانات نازل فرمائیں اور ہم نے میزان اتاری اس لیے کہ لوگ عدل و انصاف پر کاربند رہیں۔

وَقُلْ أَمَرْتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنْ
كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ
(شوری) اور کہو! میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے مجھ پر اتارا اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل کروں۔

چنانچہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ ہم پر کیوں حملہ آور ہوئے تو آپ نے جواباً فرمایا :

أنا قد أرسلنا لنخرج الناس
من ظلمة الجهالة إلى نور
الایمان ومن جور الملوک
إلى عدل الاسلام۔ ہمیں بھیجا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نور ایمان کی طرف نکالیں اور شمنشاہی استبداد سے نجات دلا کر عدل اسلام سے روشناس کرائیں۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت خلافت کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلامی مملکت کے اصول متعین کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا : تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کر لوں اور تم میں سے ہر

ضعیف میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کا حق نہ دلو دوں۔ گویا نظام عدل و قسط کا قیام، اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد ہے۔

امتیازی سلوگن

ہر نظام میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس نظام کا امتیازی سلوگن (Slogan) بن جاتے

ہیں (Capitalism) میں آزادی (Freedom) کی تکرار ملے گی۔ یہ گویا ان کے فکر کی بنیاد اور مرکز و محور ہے اس طرح اشتراکیت (Socialism) میں مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس میں نوع انسانی کے لیے کشش ہے اس مرحلے پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دونوں اعلیٰ قدریں ہیں۔ آزادی بھی ایک اعلیٰ قدر ہے اور مساوات بھی ان کے مقابلے میں اسلام نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ”عدل“ کا تصور دیا ہے وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ نہ تو آزادی اس قدر بڑھ جائے کہ مساوات کو ہڑپ کو جائے اور نہ مساوات کا ہٹا کھڑا ہو کہ آزادی جیسی اعلیٰ اقدار سے انسانی معاشرہ کو محروم کر دے۔ ”آزادی کی قیمت پر مساوات اور مساوات کی قیمت پر آزادی“ اسلام ان دونوں کے حق میں نہیں ہے۔ اسلام عدل چاہتا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جس کو اسلام کا امتیازی Slogan قرار دیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں نظام عدل کے قیام کی غرض آخر کیا ہے؟ اس طرف انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم حضرت شاہ ولی اللہؒ نے توجہ دلائی ہے وہ فرماتے ہیں :

قرآن حکیم کی واضح تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے کو حکم دیا گیا ہے، کہ نہ اسراف کیا جائے نہ تبذیر بلکہ راہ اعتدال اختیار کی جائے۔ اسراف کا مطلب ہے حد سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر سے مراد ہے بے جا اور فضول خرچ کرنا۔

- ① وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (الاعراف)
 - ② وَلَا تَبْذِرُوا مَالَكُمْ بَيْنَ يَدَيْكُمْ إِنَّ الْمُبْذِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (بنی اسرائیل)
 - ③ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ مَنْعِقِكَ
- اور کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔
اور بے جا خرچ نہ کرو بیشک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔
اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ باندھ کر

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ
مَلُومًا تَحْسُرًا - (بنی اسرائیل)

۴) وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا
وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ
قَوَامًا - (سُورَةُ الْفَرَقَانِ)

نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے ورنہ
تُو خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جائے گا۔

اور (مومن کے بندے) وہ لوگ ہیں جو خرچ
کرتے ہیں تو فضول نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے
ہیں بلکہ ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان
اعتدال پر ہوتا ہے۔

عوماً معاشرے میں تین قسم کے
معیار زندگی پائے جاتے ہیں:

ب : رفاہیت ناقصہ یعنی پست معیار زندگی جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی چیز پسند کی
جاتی ہے اس طرح حد سے زیادہ بلکہ بے جا خرچ کیا جاتا ہے اور دولت کو ضائع کیا جاتا ہے۔

ج : رفاہیت متوسطہ یعنی درمیانہ معیار زندگی جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے
میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی
بھلائی کے لیے بھی کوئی کام کر سکے اور خدا کو بھی یاد کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے رفاہیت بالغہ عیاشی کو ناپسند فرمایا ہے۔ اور ایسی معاشرت اختیار
کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان دنیا کی طلب کے اندر ہی الجھ کر رہ جائے اور
معیشت کی باریکیوں میں اُتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تعقید اور غلو کرنے لگے۔
پچانچہ لرثیم اور سونے چاندی کے برتن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن، گلوبند، ہار، طوق
پازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اسفل السافلین
میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی افکار کو مختلف قسم کی باریکیوں میں الجھا دیتی ہیں۔ رفاہیت کی
اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنیٰ سے اعراض
کیا جائے۔ لیکن رفاہیت بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز میں سے سب سے اعلیٰ
کا انتخاب کیا جائے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۱۰۷)

رفاہیت ناقصہ عموماً ان لوگوں کا معیار زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دُور پہاڑی
جگہوں پر رہتے ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲)

علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کا حال وحشی جانوروں کا سا ہوتا ہے۔ شہروں کے وہ لوگ بھی اس ذیل میں آتے ہیں جو دوسروں کی خاطر محنت کرتے ہیں مگر انھیں پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ پھر ان پر طرح طرح کے ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں جس سے ان کی حالت گدھوں اور بیلوں کی ہو جاتی ہے جن سے سخت کام لیا جاتا ہے اور محض زندہ رہنے کے لیے کچھ کھانے کو دے دیا جاتا ہے۔ پھر ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ محنت و مشقت سے فرصت ہی نہیں پاتے اور نہ وہ سعادتِ اخرویہ کی طرف متوجہ ہو پاتے ہیں بلکہ ان میں سعادتِ اخرویہ کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں رہتا جو دین کے مطابق کوئی حرکت

© rasaitojaraid.com

اگر اس طریقے سے انسان جکڑے ہوئے ہوں جس طرح بنی اسرائیلیوں کو فرعونوں نے جکڑا ہوا تھا کہ صبح سے لے کر شام تک ان سے بیگار لی جا رہی ہے۔ کسی اور بات یا اعلیٰ قدر کی طرف متوجہ ہونے کی انھیں فرصت ہی نہیں ہے۔ اس طرح اگر کسی انسانی معاشرے میں معاشی ناہمواری کی یہ کیفیت ہو جائے کہ لوگوں کی اکثریت صرف دال روٹی کے حصول میں سرگرداں ہو۔ معاملہ جب یہ ہو جائے کہ انسان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے کمر توڑ دینے والی محنت کرے اور پھر بھی اس کی ضروریات پوری نہ ہوں تو انسان کا حیوانی سطح پر آجانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس لیے اسلام نظامِ عدل و قسط قائم کرنا چاہتا ہے نہ صرف قانونی نظام بلکہ سماجی عدل بھی۔ تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل کریں اس سے لو لگائیں اس سے محبت کریں اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کریں اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ انھیں اس کے لیے فرصت ہو، وقت ملے اور یہ نہ کہہ سکیں۔

ع۔ تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اسلام کے معاشی نظام کے دورِ رخ | اسلام کس قسم کا معاشی اور اقتصادی نظام قائم کرنا چاہتا

ہے؟ اس کی وضاحت سے قبل اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی

نظام کے دو رخ یا پہلو ہیں یا یوں سمجھیے کہ دو حصے ہیں مگر اس طرح کہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک مکمل نظام کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے، اپنا نظریہ ملکیت اور نظریہ حقوق ہے اور اسی طرح دونوں کا اپنا نظریہ قدر زائد ہے۔ معاشی نظام میں اہمیت رکھنے والی تمام چیزیں ان دونوں نظاموں میں جدا جدا ہیں اور اپنا جدا گانہ فلسفہ رکھتی ہیں۔ سورہ حزن کی آیت مبارکہ

مَرْجِ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا
بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ
وہ روئیں جو برابر چل رہی ہیں مگر ان کے
درمیان ایک غیر مرقی پردہ حائل ہے جو انھیں
باہم مدغم نہیں ہونے دیتا۔

وہ ان دونوں کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

غلط سمجھ ہمارے ہاں غلط سمجھ ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے نقطہ نظر کے مطابق اسلام کے معاشی نظام کی تشریح و تعبیر کرتا ہے۔ جو لوگ سوشلزم اور کمیونزم سے متاثر ہیں وہ انفرادی ملکیت کی کائل نفی کرتے ہیں۔ ضرورت سے زائد ہر چیز چھین لینے کی بات کرتے ہیں اور دوسرا پہلو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں مثلاً قانون وراثت بھی تو قرآن مجید میں موجود ہے اس کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام میں بھی جبری مساوات کی نفی کر دی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر تصرف بلکہ ورثاً جائیداد کی منتقلی کا حق بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو کمیونزم سے خار کھاتے ہیں تو اسلام کے قانونی نظام کا دم بھرتے ہیں جبکہ اس کے روحانی نظام کو نظر انداز کرتے ہیں۔ انفرادی ملکیت کو اس قدر نمایاں کرتے ہیں کہ ایک استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا طرز عمل یہ دونوں قسم کے نقطہ ہائے نظر کسی غلط فہمی کی بنیاد پر بھی پیدا ہو

سکتے ہیں اور خلوص نیت کے ساتھ بھی اسلام کے قرآن اول میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوئی

چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے جن پر زہد اور فقر کا غلبہ تھا ”آیہ کنز“ کو ظاہری معنوں پر محمول کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سونا چاندی اور سرمایہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ اس سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ خلافت راشدہ نے ان کی اس رائے کو انتہا پسندانہ قرار دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں انھیں مدینہ بدر کیا گیا اور مدینہ سے باہر ہی ان کا انتقال ہوا۔ ان کے زہد کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جب انتقال ہو رہا تھا تو صرف ان کی اہلیہ محترمہ ان کے پاس تھیں۔ گھر میں ضرورت کی چیزیں ہی تھیں مگر ان کے احساسات یہ تھے کہ ان کی موجودگی پر بھی پریشان تھے اور بار بار کہتے تھے: ”حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم اپنے گرد سانپ اور بچھو جمع کر لو گے اور یہ مجھے نظر آرہے تھے“ وہ دیکھو تو ہے، استعمال کے کپڑے ہیں اور یہ سب بچھو ہی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام قانونی نظام سے روحانی نظام کی طرف قدم بڑھانے کا تقاضا کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کی طرف پیش قدمی کرے اور اسی بات کے مفاد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو کامل خلوص کے ساتھ لائق ہوا، لیکن بنیستی کے ساتھ بھی یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اخلاقی و روحانی نظام کے اصول | اسلام کے اخلاقی یا روحانی نظام کے چار اصول ہیں۔

- ① ملکیت کی نگلی نفی۔
- ② انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے اس کی عطا ہے۔
- ③ انسان کا حق اس کی جائز ضروریات ہیں۔ بعض احادیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں متعین فرما دیا ہے یعنی دو وقت کے کھانے کے لیے سامان، سر چھپانے کے پھت، دو جوڑے کپڑے اور عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے بیوی۔
- ④ اب جو کچھ انسان کے پاس بچ رہے اسے دوسروں کی ضروریات کے لیے وقف کر دے گو کہ قانونی طور پر اسے اس پر حق تصرف حاصل ہے لیکن اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرف منتقل ہو۔

تو یہ اپنے طور پر ایک مکمل نظام ہے اس میں نظریہ ملکیت بھی ہے اور اپنے حق کا تصرف بھی۔ نیز اگر قدر زائد ہے تو اس کا مصرف بھی موجود ہے۔

اخلاقی نظام میں ربو کا لفظ دو چیزوں کے ضد کے طور پر آیا ہے۔

۱۔ ربو بمقابلہ بیع وَاَحَلَ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (البقرہ)

۲۔ ربو بمقابلہ صدقات اور تزکیہ نفس کے واسطے خرچ کرنے کے جیسے ”وَمَا أُذِيتُمْ مِنْ سُلُوكِ قُرَيْشٍ وَجَعَلَ اللَّهُ فَاوِلَتَهُ هُمُ الْمُضْعِفُونَ“ (الروم)

اسلام کی روحانی تعلیمات میں اسی مفہوم کے ساتھ سورۃ البقرہ کی اس آیت میں کہ يَمْنَعُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصَّدَقَاتِ (اللہ ربو کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے)۔ ان آیات میں صدقات کے مقابلے میں ربو کا لفظ آیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک انسان یا مثلاً ملازم پیشہ آدمی کی ضرورت پوری ہونے کے بعد کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اب اس فاضل سرمائے کے دو مصرف ہیں یا تو وہ اسے کسی کاروبار میں لگائے۔ اس صورت میں اس کی محنت اس میں شامل نہیں ہوگی۔ اب اس اخلاقی نظام میں فاضل سرمائے سے جو بڑھوتری ہوگی وہ بھی ربو قرار پائے گی۔ اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اسے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے وہ لوگ جن کے پاس کاروبار کی بنیاد ڈالنے کے لیے سرمایہ موجود نہیں انھیں سرمایہ فراہم کیا جائے تاکہ وہ رزقِ حلال باعزت طریقے سے حاصل کرے کے قابل ہو سکیں۔ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی محنت میں سے حصہ وصول کرنا کو قانونی طور پر جائز بھی ہو، اخلاقی اور روحانی سطح پر یہ ممنوعات کی فہرست میں شامل ہوگا۔ اس لیے اس فاضل سرمائے کا مصرف یہ ہونا چاہیے کہ ضرورت مند اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر زیادہ نہیں تو انھیں یہ سرمایہ بطور قرض حسد ہی دیا جائے تاکہ وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور معاشرے میں صاحبِ عزت اور صاحبِ حیثیت بن سکیں۔ قرآن کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا یہی وہ نکتہ ہے جسے اپنا کر ایک جنتی معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

عفو اور قصاص

اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا فرق و تفاوت بلکہ بعض اوقات تضاد صرف معاشی تعلیمات ہی میں نہیں بلکہ دوسرے قوانین میں بھی ہے مثلاً مظلوم بدل لینے کا قانونی حق رکھنے کے باوجود معاف کر

سکتا ہے اور اخلاق اور روحانیت کا تقاضا عفو و درگزر ہی ہے۔ جبکہ قانون قصاص لینے ہی میں خیر محسوس کرتا ہے اور اسی کی ترغیب دلاتا ہے۔

قانونی اور فقہی نظام | اس کے بعد آئیے اسلام کی قانونی معاشی تعلیمات کی طرف اور ان کے ضمن میں سمجھئے اسلام میں

محنت کے تصور کو اسلام کا قانونی معاشی نظام ایک طرح کی Controlled capitalism ہے کہ اس میں تینوں جہتی تقاضے موجود ہیں۔ اس میں نجی ملکیت (Private ownership)

بھی ہے اور ذاتی دلچسپی بھی، اور ساتھ ہی ساتھ آزاد معیشت کا تصور بھی۔ البتہ اس میں حلال اور حرام کی تفریق موجود ہے۔ پابندی کمانے پر نہیں بلکہ حلال سے تجاوز کرنے پر ہے بلکہ قانون حق تصرف تسلیم کرتا ہے اور اپنے مرضی سے اللہ کی راہ میں دینے کا تقاضا بھی کرتا ہے البتہ جو مرض ہے مثلاً زکوٰۃ وہ جبراً وصول کر لی جائے گی۔ لیکن زکوٰۃ کے علاوہ اس بدر کوئی قانونی پابندی نہیں ہوگی مگر ذہن میں رہے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو دو پہلوؤں سے حدود کا پابند کیا ہے تاکہ یہ ایک لعنت بن کر نوع انسانی پر مسلط نہ ہو جائے۔ ایک تو وہ خطوط متین کیسے گئے جن کی موجودگی میں سرمایہ کاری سرمایہ داری بننے سے محفوظ رہے دوسری طرف آزاد معیشت میں بعض لوگوں کے آگے بڑھ جانے اور بعض لوگوں کے پیچھے رہ جانے کے امکان کو تسلیم کر کے جبری مساوات کی بجائے اس فرق و تفاوت کو بڑی حد تک ختم کرنے اور اس درمیانی خلا کو پُر کرنے کے لیے راستہ تجویز کرتا ہے۔ نظام زکوٰۃ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسلام نے ایک حد فاصل قائم کر دی ہے کہ جو بھی اس حد سے آگے بڑھ جائیں وہ مال دار ہیں اور دینے کے مکلف ہیں اور جو اس حد تک نہیں پہنچ سکے وہ مستحق اور ضرورت مند ہیں معروف معنوں میں پیلے والوں کو Haves اور دوسروں کو Have-nots شمار کر لیجیے۔ لیکن یہ تقسیم آپ کے اختیارات کے تابع نہیں کہ آپ جسے چاہیں Have اور جسے چاہیں have-nots بنادیں۔ بلکہ نصاب کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ اتنے اونٹ یا اتنا سونا وغیرہ ہے تو دینے والوں کی صف میں اور اگر اس سے کم ہے تو لینے والوں کی صف میں۔ اس تقسیم کے بعد یہ

لے وَإِنْ تَعَفَّوْا وَتَصَفَّحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (التابن)

لے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرہ)

یہ اصول قائم کر دیا گیا۔

تَوْخِذْ مِنْ أَغْنِيَاءِهِمْ وَتَرِدْ إِلَىٰ فُقَرَاءِهِمْ یعنی اغنیاء سے لے کر مستحقین میں تقسیم کی جائے گی تاکہ اس تفریق کا کسی حد تک خاتمہ کیا جاسکے جو معاشرے میں پیدا ہو کر بہت سی برائیوں کا باعث بنے گی۔

ارتکازِ دولت

لیکن ایسا نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو ارتکازِ دولت کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں اور کچھ لوگ ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہ جائیں۔ اسلام اجتماعِ و ارتکازِ دولت کا مخالف ہے، سرمائے کو گردش میں لانے کا متقاضی ہے لیکن وہ سرمائے کی فطری گردش کے حق میں ہے۔ سرمائے کی مصنوعی گردش جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔ اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس

کَلَّا يَكُونُ دَوْلَةٌ بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ
مِنْكُمْ الحشر مائیں ہی اُلٹ پھیر میں نہ رہ جائے۔

جیسے ایک کروڑ پتی کی بیٹی ایک دوسرے کروڑ پتی کے بیٹے سے بیاہی گئی۔ لاکھوں کا جہیز اس گھر میں جمع ہو گیا جہاں کروڑوں روپے پہلے سے موجود ہیں۔ سرمایہ تو گردش میں آیا مگر مصنوعی انداز میں، اور معاشرے کو اس سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور یہ سرمایہ نچلے طبقات تک منتقل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ایک سرمایہ دار کے بیٹے کی سالگرہ پر لاکھوں روپے کے تحائف جمع ہو گئے۔ سرمایہ کی گردش کا عمل یہاں بھی وقوع پذیر ہوا لیکن بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ (سرمایہ داروں کے درمیان) اسلام کی منشاء یہ ہے کہ معاشرے میں جو بھی ذرائع پیداوار ہیں (اور زمین سب سے بڑا ذریعہ پیداوار ہے) ان کی منصفانہ تقسیم ہو اور ان کا حاصل پورے معاشرے میں پھیلے۔ 'Controlled'

'capitalism' کی جو اصطلاح میں نے استعمال کی ہے اب اسے 'Internally managed'

'capitalism' کے الفاظ میں ادا کیا جا رہا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام بھی یہ بات جان چکا ہے کہ ننگی اور عریاں سرمایہ داریت اس دور میں نہیں چل سکتی اس کا کوئی مستقبل نہیں بلکہ وہ تو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔

بقول علامہ اقبال

دیارِ مغرب کے رہنے والوں خدا کی بستی دکان نہیں ہے
گراں جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سربایہ دارانہ نظام کلی طور پر اپنے فلسفے کے ساتھ اب
کفالتِ عامہ قابل قبول نہیں رہا۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں اور وہ

تباہی کے کنارے تک پہنچ چکا ہے۔ اس لیے اپنے تحفظ کے لیے قابل عمل
اقدامات کر رہا ہے جس کی نمایاں مثال برطانوی معاشرہ میں ملتی ہے وہاں ان لوگوں
کے لیے جو کام نہیں کر پاتے ہونگار نہ ہونے کی صورت میں الاؤنس مقرر کر دیے
گئے ہیں۔ اس طرح بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمے لے لیتی ہے ،
آزاد معیشت کا تصور بھی مجروح نہیں ہوتا اور ضرورت مند لوگوں کی کفالت کا سامان بھی
کر دیا جاتا ہے لیکن غور کیا جائے تو اسلام کے نظام معیشت میں یہ اصول وجودہ سو
سال پہلے طے کیا جا چکا ہے۔ جہاں سربایہ دارانہ نظام یا بے خدا معاشرہ ٹھوکیں کھا کر
اب پہنچ رہا ہے۔ اسلام چودہ سو سال پہلے یہ بتا چکا ہے کہ کمانے کھانے کی آزادی ہے
اور آگے بڑھنے کی بھی لیکن جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی معاشرہ کا
فرض ہے اور زکوٰۃ و عشر کا نظام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کفالتِ عامہ کے اصول کو (Collective insurance) بھی کہا جاسکتا ہے
اس فرق کے ساتھ کہ انشورنس خواہ کسی قسم کی ہو اسے انسان اپنی کمائی میں بچت کر کے
حاصل کرتا ہے لیکن اسلام نے جو اصول وضع کیا ہے اس میں ایک طبقہ بچاتا ہے اور
جمع کرتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا فائدہ بھی اُسے ہی پہنچے جس نے بچایا اور جمع
کیا ہے بلکہ ایک مال دار اور غنی ہے جو بچاتا اور جمع کرتا ہے۔ اور دوسرا طبقہ جو ضرورت مند
ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور اس کی یہ کفالت نظام زکوٰۃ اور عشر کے
ذریعے سے ہوتی ہے۔ اب آئیے اس کے فقہی اور قانونی نظام میں کمائی میں حلال و حرام
کی قیود کی طرف۔

حلال و حرام کی حدود

اسلام پہلی شرط حلال و حرام کی پاسداری کی عاید کرتا ہے تاکہ معاشرے میں یہ تیز اٹھ جانے کے بعد

جو طوفان بدتریزی برپا ہوتا ہے اور انسانیت کی حیوانیت میں تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اس کا سد باب کیا جاسکے۔ اس کے بعد ان اقدامات پر نظر ڈالیے جو قرآن مجید اپنے معاشی نظام میں وضع کرتا ہے اور عیش و عشرت کیجیے۔ لیکن یہ وضاحت بہر حال ضروری ہے کہ قرآن مجید معاشیات کی کتاب نہیں ہے کہ اس نے عنوانات قائم کر کے معاشی اصطلاحات پر بحث کی ہو۔ ایک ایک نکتے کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہو لیکن کتاب ہدایت ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں زندگی کے اس پہلو میں بھی رہنمائی کی گئی ہے۔ قرآن مجید نے جو ہدایات دی ہیں ان سب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اسلام اپنے قانونی نظام میں بھی زیادہ سے زیادہ محنت پر انحصار کرتا اور سرمایہ کو کم از کم اہمیت دیتا ہے۔ محنت اور سرمائے کے امتزاج سے معاشی ڈھانچہ کی تشکیل کو وہ تسلیم کرتا ہے لیکن محض سرمائے کی بنیاد پر بغیر محنت کے کمائی کو وہ اچھا نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک اصل چیز محنت ہے سرمایہ نہیں مثلاً اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ کسی کاروبار میں سرمایہ لگانے والا شخص منافع میں شریک ہو، لیکن نقصان میں حصہ دار نہ ہو اور منافع کی بھی متین شرح لینے پر مہصر ہو تو یہ ایک انتہا پسندانہ سطح ہے جس میں محض سرمائے کی حیثیت سے کمائی کا حقدار بنا۔ اس مثال سے چار امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) سرمایہ بحیثیت سرمایہ منافع کا مستحق ٹھہرا (۲) اپنے تحفظ کی ضمانت (۳) نقصان میں عدم شرکت (۴) نفع کی ایک متعین شرح۔

جہاں یہ چاروں صورتیں جمع ہوں تو یہ ربوہ ہے۔ اور اسلام نے اپنے نظام معیشت میں اس کی جو کاٹ دی ہے۔ زنا شراب غرض کسی بُرائی کے بارے میں قرآن مجید نے وہ سخت لہجہ اختیار نہیں کیا جو ربوہ کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ ربوہ کے بارے میں اس کی آتش غضب یوں بھڑکتی ہے۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود کو کسی کے ذمہ ہے چھوڑ دو۔ ہاں اگر نہیں کرو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ
وَرَزُوا مَا بَيعَ مِنَ الرِّبَا إِنَّ
كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۚ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا

فَاَذْنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرُسُوْلِهِ - البقرہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اس قدر سخت وعید کسی اور معاملے میں نہیں آئی اور اس کی بہترین وضاحت اور ہماری ذہنی سطح کے مطابق بات قرآن کے مزاج شناس اور اللہ کے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمائی :

الرِّبَا سَبْعُوْنَ جَزْءًا اَلْاَيْسَرُهَا رِبُوْهُ كَسْتَرْجِزُوْا هِيَ اَنْ سَبَّ سَبَّ سَبَّ
ان يَنْتَحِلَ الرَّجُلُ اَمَّتَهُ ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے
(بیہوشی) نکاح کرے۔

یہ انداز گھلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تشبیہ کیوں اختیار کی لیکن غور کریں تو اس کی حکمت و روش کی طرف ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں طبعی طور پر نفرت ہے اور بعض چیزیں اس کے ہم پایہ بُرائی ہیں لیکن ہم انہیں جبلی یا طبعی طور پر بُرائی نہیں سمجھتے جب کوئی شخص انہیں پہلی چیزوں کے مقابلے میں لائے گا ان سے تشبیہ دے کر بیان کرے گا تو حقیقت واضح ہوگی۔ یہی حکمت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان میں پوشیدہ ہے۔ تم شاید اسے جُرم نہ سمجھو یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لو کہ سود لے لیا تو کون سی بُرائی ہوگی یہ دراصل ماں سے نکاح کرنے کے مترادف ہے۔ گویا ہمارے نظامِ شریعت میں بدترین بُرائی ربوٰ قرار پاتی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں سب سے زیادہ اہمیت ہی سرمائے اور اس کے تحفظ کو ہے اور اسلام نے اسے ربوٰ قرار دے کر اس کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس میں سرمایہ مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے آثار چڑھاؤ کا باعث بنتا ہے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے اپنی مالی حیثیت کا تعین کرتا ہے اب وہ سٹہ کھیلتا ہے۔ زبانی کلامی ہی خرید اور بیچ دیا۔ لیا اور دیا صرف اپنی مالی حیثیت کی بنا پر مارکیٹ میں آثار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے ورنہ حقیقت میں نہ کچھ لیتا ہے اور نہ دیتا ہے کبھی یکدم مال خرید کر قیمتیں چڑھا دیتا ہے اور کبھی مال ریلیز کر کے قیمتیں گھٹا دیتا ہے۔ یہ سب سرمائے کا کھیل ہے۔ سرمایہ منڈی سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ کراچی شاک ایکس چینج میں یہ دلچسپ صورت حال دیکھی جاسکتی ہے کہ نظری طور پر سودے ہو رہے ہیں نہ کچھ لینا اور نہ کچھ دینا۔ پاگلوں کی طرح چیخ پکار ہوتی ہے اور سیمٹھوں سا ہوکاروں کو اطلاع دینے کے لیے دوڑتے ہیں۔ یہ منڈی کا آثار چڑھاؤ ہو رہا

ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کا کھیل۔ اسی ضمن میں انشورنس آتی ہے۔ ان سب چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ انشورنس میں دو پہلو ہیں جو حرمت لیے ہوئے ہیں ایک تو مجوا ہے اور دوسرا سرمائے کے تحفظ کی ضمانت اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے ماچس بنانے کا کارخانہ قائم کرتا ہے۔ اور دس لاکھ روپے کی انشورنس کراتا ہے اس کا سرمایہ آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ کوئی اتفاقی حادثہ آگ یا سیلاب اس کارخانے کو تباہ کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے سرمائے کا تحفظ یوں کرتا ہے کہ اس کی انشورنس کرواتا ہے اور دوسرا ظلم یہ کرتا ہے کہ یہ تحفظ اپنی جیب پر بوجھ ڈال کر حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کا سالانہ پرییم بھی جو دہ ادا کرتا ہے لاگت میں شمار کرتا ہے۔ ماچس کی ایک ڈبیہ پر وہ پرییم کی لاگت ڈالتا ہے اور ضرورت مند سے اس کی قیمت وصول کرتا ہے صرف اس لیے کہ سرمایہ اس کا محفوظ ہو جائے۔ کسی حادثے کی صورت میں جہاں تک اجتماعی مفاد کا تعلق ہے کہ ہمارا ایک ملک ایک قوم ہے جس کے مادی مفادات مشترک ہیں۔ تباہی تو آگئی اور دس لاکھ روپے کا سرمایہ ملکی سطح پر ضائع ہو گیا۔ لیکن سرمایہ دار اس نقصان میں سے ایک پائی بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں اور خریدار کا خون چوس کر اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے یہ سرمایہ داروں کی امداد باہمی کا نظام ہے جو اپنے سرمائے کا تحفظ کر رہے ہیں اس کی حرمت کے لیے اسلام نے قطعی فیصلہ کر دیا ہے: کٰی لَا یَكُوْنُ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ۔

ایک دائرہ اور بھی ہے جس میں بعض چیزیں حلال اور بعض حرام ہیں اور بعض وہ ہیں جن کی حلت و حرمت میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو ہم ایک ہی گروپ میں لاتے ہیں۔ ایک شخص محنت کر سکتا ہے۔ صحت مند اور معنوی ہے لیکن اس کے پاس سرمایہ موجود نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے جس کے پاس سرمایہ موجود ہے۔ یہ دونوں مل کر کاروبار کرتے ہیں۔ ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس میں اپنی محنت شامل کرتا ہے۔ اس محنت اور سرمائے کے امتزاج کو مضاربت کہتے ہیں۔ یہ اسلام میں جائز ہے لیکن پسندیدہ نہیں۔ جس طرح طلاق جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے پاس صرف اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت ہی پوری کر سکتا ہے تو وہ

خود کاروبار کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے لیکن اگر اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی موجود ہے مثلاً وہ ملازمت کرتا ہے تو اس کے پاس جو ضرورت سے زائد سرمایہ ہے وہ اپنے مجبور بھائی کو دے دے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت میں سے حصہ نہ لے۔

مضاربت میں بھی شرط رکھی گئی ہے کہ نقصان کا پورا بوجھ سرمائے پر پڑے گا اور محنت کش ایک پائی کے نقصان میں بھی شریک نہیں ہوگا۔ اسلام نے محنت کے تحفظ کو منافع کا جائز ذریعہ قرار دیا ہے اس صورت میں وہی مضاربت جائز ہوگی جس میں نقصان کی پوری ذمہ داری سرمایہ فراہم کرنے والا شخص برداشت کرے۔ اور منافع میں وہ محنت کش کا سرمایہ بھی ہو۔ لیکن یہ وضاحت دوبارہ کر لی جائے کہ اسلام کے نزدیک یہ عمل بھی پسندیدہ نہیں۔ اس کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اصل زائد سرمایہ رکھنے والا محض یہ سرمایہ کسی دوسرے ضرورت مند مسلمان بھائی کو قرضِ حسد دے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور اس کی خوشحالی قومی خوشحالی میں حصہ دار بنے۔ اس سے اجتماعی زندگی میں حسن پیدا ہوگا۔ اگر آپس کے معاملات مجبوری میں طے پائیں تو یہ حسن کہاں پیدا ہوگا۔ قرآن مجید بیع کو بھی باہمی رضامندی سے مشروط کرتا ہے۔

عَنْ تَرَا ضٍ بَيْنَهُمَا (النساء) یعنی تمہاری رضامندی سے۔

مثال کے طور پر آپ کو ایک جوتا خریدنا ہے۔ آپ مارکیٹ میں گھومیں پھرئیں آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ایک معیاری جوتے کی قیمت سو سو روپے ہے۔ آپ خریدتے ہیں تو اس میں کسی مجبوری کا دخل نہیں ہوتا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت لاگت اس قدر ہے۔ اس پر منافع کی شرح اندازاً یہ ہوگی۔ یہ باہمی رضامندی کا سودا ہے لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص کسی مجبوری کے تحت ایسا کر رہا ہو چاہے قانوناً یہ بات جائز ہوگی کہ سرمایہ رکھنے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحب! وہ میرے پاس اپنی خوشی سے آیا ہے اور سرمایہ لے کر کاروبار کرنے کی صورت میں اس کے منافع میں مجھے شریک کرنے کی پیشکش کرتا ہے۔ اس میں کسی مجبوری کو کوئی دخل نہیں، کہنے کو تو یہ بات ہے لیکن حقیقتاً مجبوری کو اس میں دخل ہے اگر اس کے پاس سرمایہ موجود ہو تو وہ کسی کو اپنے غنِ پسینے کی کمائی میں کیوں شریک کرے گا۔ یہ مضاربت کی وہ شکل

ہے جو حلال ہے لیکن اسلام اسے پسند نہیں کرتا۔

مزارعت اس قبیل کی ایک چیز مزارعت بھی ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے دوسرا اس پر محنت کرتا ہے اس کی پیداوار میں زمیندار کو شریک

کرتا ہے صنعتی انقلاب کے بعد مشین اور دوسری چیزیں یا معدنیات بھی ذرائع پیداوار میں شامل ہو گئیں۔ لیکن قدیم ترین ذریعہ پیداوار زمین ہی ہے اور زمین کے بارے میں بقول علامہ اقبالؒ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے :

رزق خود را از زمین بردن رواست

اِس متاع بندہ و ملک خداست

مزارعت کے بارے میں ہمارے ہاں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اسے حرام مانتے ہیں وہ کسی طرح کی مزارعت اور غیر حاضر زمینداری کو جائز نہیں سمجھتے، دوسرے فقہانے احادیث پر ذرا غور کر کے کچھ ایسے پہلو نکالے ہیں جن سے کچھ گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس دور کے خاص حالات تھے۔ مصالح مرسلہ یا استحسان کے اصول کے تحت ایسی گنجائش نکالی گئی ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت پر لفظ ربوا استعمال کیا ہے۔

حضرت رافع بن خدیج کے بارے میں حضور کو معلوم تھا کہ ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے کہیں باہر جا رہے تھے۔ دیکھا کہ رافع کھیت کے پاس کھڑے ہیں پوچھا : تم یہاں کیسے ؟ انھوں نے عرض کیا : زمین فلاں کی ہے میں نے محنت کی ہے اور میرے اور اس کے مابین یہ شرح معین ہوئی ہے تو حضور نے فرمایا قد اربیتما (تم نے ربوا کا معاملہ کیا ہے) یہ زمین ٹوٹا دو جو کچھ اس پر تھا را خرچ ہوا ہے وہ تم لے لو اس لیے کہ اس زمین میں اس کی کون سی محنت شامل ہے جس کا وہ معاوضہ لے رہا ہے صرف اس وجہ سے کہ زمین کا مالک ہے۔ وہ اپنے بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے حصہ وصول کر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا یہ فتویٰ آنکھیں کھول دینے والا ہے اور ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے میسے تو یہاں ملک کی نوے فی صد آبادی حنیفیوں پر مشتمل ہے لیکن ایسے ایسے اہم معاملات میں امام ابوحنیفہ کا فتویٰ کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یا تو انھیں امام اعظمؒ کہا اور مانا جاتا

ہے اور سید الفقہار بھی۔ لیکن جہاں ان کا فتویٰ اچھا نہیں لگتا اسے اٹھا پھینکنے اور دیوار پر دسے مارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ہماری دو عملی ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے اور مراعت اور مضاربیت کو ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے۔

اب آئیے چوتھی صورت کی طرف، اسلام میں جو مال موجود نہ ہو اس کے بیع کی جو شکل بھی ہوگی حرام ہوگی۔ یہ جتنے ایندوانس سودے ہو رہے ہیں یہ تمام معاملات جن میں سرمایہ کھیلتا ہے ان سب کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ بیع وہ ہے کہ مال موجود ہے اور قیمت ادا کر دی گئی یا دو چیزیں ہیں جن کا تبادلہ ہو گیا۔ ایک ہاتھ سے دیا دوسرے ہاتھ سے لیا، یہ بیع ہے اور اس میں بھی (عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ) باہمی رضامندی ضروری ہے اگر مجبوری سے فاکم اٹھا گیا ہے، اگر کہیں مصنوعی قلعہ کے ذریعے سے ریٹ بڑھا دیے گئے ہیں، اگر کہیں کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے تو اس میں حرمت کا پہلو شامل ہو جائے گا ہمارے ہاں جو سودے بازی ہوتی ہے۔ زمین آپ نے ٹھیکے پر دی ہے اب چاہے کسان کو کچھ بچے نہ بچے آپ کا ٹھیکہ محفوظ ہے۔ باغ میں ابھی پھل نہیں آیا اس کا سودا ہو گیا ہے۔ یہ سب حرام مطلق ہے، ہمارے دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اُدھار کی شکل میں صرف ایک سودا جائز ہے جسے بیع سلم کہتے ہیں دو چیزوں کا بالکل تعین ہو جائے اور ان میں سے ایک چیز کا لمبا دے دی جائے یہ بیع سلم ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز فلاں وقت لے لوں گا اور یہ بیعانہ لے لیجیے۔ اگر وقت پر وہ چیز نہ دے سکا تو بیعانہ ہضم۔ اب یہ بیعانہ کس کھاتے میں ہضم ہو رہا ہے۔ وہ سودا تو پورا ہو نہیں پایا۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت اس وجہ سے ہمارے ہاں رواج پا گئی ہیں کہ پہلے یہاں شریعت کوئی ہیئت حاکمہ کی حیثیت سے ہے ہی نہیں مارکیٹ میں جو رواج چلا وہ ہم نے اختیار کر لیا۔

OVER TRADING

ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور وہ اوور ٹریڈنگ میں پچاس لاکھ روپے کا مال لے لیتا ہے تو اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں تو پانچ لاکھ کا سودا کر لیجیے۔ پانچ لاکھ اس وقت آپ کو دے دینا ہوگا۔ اس ادائیگی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ بیع کے ضمن میں بھی حدود قائم کر دی گئی ہیں اور ان سب کا مقصد یہی ہے کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے

کا موقع نہ ملے۔ اسی سلسلے میں میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے کہ اسی لاہور کے ایک بڑے دارالعلوم میں ایک صاحب سے ملنے گیا۔ عالم دین ہیں، شیخ الحدیث ہیں، حدیث کا درس دے رہے تھے، میں بھی بیٹھ گیا۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے جو کئی طریق سے آئی ہے، متن وہی ہے طریقے مختلف ہیں۔

”لایبیع الحاضر للبادی“ یعنی کوئی کسی جگہ کا رہنے والا شخص باہر سے آنے والے کے مال کو فروخت نہ کرے، درس مکمل ہو گیا۔ موجودہ کاروبار کے بارے میں کوئی ریفرنس نہ آیا۔ ہمارے معاشرے میں بیع و شرائع کے جو طریقے ہیں اس پر کوئی بحث نہ ہوئی۔ میں نے سوال کیا: ”حضرت! ہمارے ہاں جو آڑھت کا کاروبار ہوتا ہے اس حدیث کی

روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟“
 شیخ الحدیث نے جو جواب دیا وہ آپ بھی سنیں اور تعجب کیجیے۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا: ”یہ آڑھت کیا ہوتی ہے؟“ اب یہ تجاہل عارفانہ تھا یا فی الواقع انھیں معلوم نہیں تھا۔ بہر حال میں تونیت کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس دور میں شہر لاہور میں ایک شیخ الحدیث جانتے نہ ہوں کہ آڑھت کیا ہوتی ہے، یہ بات بہر حال بظاہر قابل قبول نہیں ہے۔ میں نے جب تشریح کی کہ یہاں کچھ لوگ دکانیں بنا کر بیٹھتے ہیں منڈی ہوتی ہے، ان کا اڈہ ہوتا ہے۔ باہر سے لوگ جنھوں نے کاشت کی ہے، اناج اور سبزیاں لے کر آتے ہیں مختلف منڈیاں ہیں، وہ ان کا مال فروخت کرتے ہیں، منڈی والے کمیشن لیتے ہیں۔ ان کا جواب تھا کہ ”یہ تو مطلقاً حرام ہے۔“ اب اندازہ کیجیے کہ یہ فیصلہ کتنا قطعی ہے۔ اس میں بھی لوگوں نے حلال کے بہت سے پہلو نکال لیے کہ دو طرفہ آڑھت کا حکم تو یہی ہے لیکن اگر ایک طرف کمیشن لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوگا اس لیے کہ دوسری شکل ہو جاتی ہے گویا کہ وہ خریدار کی طرف سے وکیل بن گیا۔ جو وکالت کر کے اس کی طرف سے مال کا خریدار ہے، اس طرح وہ اپنی وکالت کی اُبرت لے رہا ہے جس میں اس کے لیے جلت کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ اس تاویل میں بھی کسی بدیتی کو دخل نہیں لیکن میں عرض کروں گا جو چیز زمانے میں رواج پا جائے ہمارے ہاں فقہار نے اصول ایسے بنائے ہیں کہ جو عموماً بلوی ہو کوئی چیسہ عام ہو گئی ہو یا زمانے کا ایک خاص نظم